چاند چہرے
سمندر آنکھیں
مقصود الٰہی شیخ کے دس نئے افسانے
مرتب: محمد شفیق

ISBN NO. 095 115 6691

Title: Chand Chehray Samunder Aankhein

Edition: 1, (2004)

Edited by: M. Shafique

Publisher: Yasmin Aadil,
H # 4, Street 39, Sector G-6/2, Islamabad - Pakistan
Tel: +92-51-2874025

Pakistan Distributor: Mr. Books
10-D, Super Market, Islamabad - Pakistan

UK Distributor: The Book Centre, Express House,
White Abbey Road, Bradford. BD8 8EJ

نام کہانی: چاند چہرے سمندر آنکھیں

کہانی کار: مقصود الٰہی شیخ (24 Park Hill Drive, Bradford. BD8 ODF)

مُرتب: محمد شفیق (20 Whitby Road, Bradford, BD8 9JU)

طبع اول: مئی 2004

سرورق: جمیل جمی

مقصود الٰہی شیخ کے دس نئے افسانے

چاند چہرے سمندر آنکھیں

مقصود الٰہی شیخ کے دس نئے افسانے

مرتب

محمد شفیق

پبلیشر: یاسمین عادل

مکان نمبر 4، گلی نمبر 39، سیکٹر G-6/2، اسلام آباد۔ فون: +92-51-2874025

پرنٹرز: پکٹوریل پرنٹرز پرائیوٹ لمیٹڈ

21، آئی اینڈ ٹی سنٹر، آبپارہ اسلام آباد۔ فون: 696 / 2822692-51-92+

انتساب

''افکار کراچی'' ''انشاء کلکتہ'' ''ابلاغ نوشہرہ'' ''شاعر ممبئی'' ''شمع دہلی''

''شب خون الہ آباد'' ''فنون لاہور'' ''ہفت روزہ راوی بریڈفورڈ''

''اخبار جہاں کراچی'' ''روزنامہ ملت لندن'' ''روزنامہ جنگ لندن''

جیسے بلند پایہ رسائل واخبارات کے نام

جن کے مسلسل مطالعہ نے مجھ میں ذوق ادب اور افسانوں سے دلچسپی پیدا کی

اور

اپنے دوست اے ڈی انجم کے نام

حسن ترتیب

نمبر شمار	عنوان	قلم کار	صفحہ
i	شفیق صاحب	مقصود الٰہی شیخ	1
ii	عرضِ مرتب	محمد شفیق	2
iii	مقدمہ	ڈاکٹر محمود الرحمٰن	5
iv	مہجری ادیب	صلاح الدین پرویز	14
v	مقصود الٰہی شیخ کی فنی تکمیل	ارشد نعیم	18
vi	چاند چہرے سمندر آنکھیں	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	30

افسانے

1	دست تہہ سنگ		38
2	باز دید		45
3	زوال، لازوال		55
4	دو چار قدم		71
5	دھواں دھواں سی زندگی		78
6	مجبوریاں		96
7	پتوں پر تصویریں		103
8	طرز تغافل نہ عرض تمنا		117
9	سچ مچ		130
10	لکڑی کی تلوار		160

شفیق صاحب

محمد شفیق ہمارے دوست ہیں۔ سادہ و مخلص انسان' پرانے وقتوں کے اصلی گھی کی طرح خالص۔ ان کی ذاتی صفات کی فہرست طویل ہے۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کو تعلیم یافتہ لوگ اہمیت نہیں دیتے مگر ہمارے ناخواندہ بھائیوں کے لیے انکم ٹیکس' پاسپورٹ اور ویزہ کے مسائل بڑے پریشان کن ہوتے ہیں۔ ہمارے شفیق صاحب بلا امتیاز علاقہ و برادری ہم وطنوں کی مدد کرتے ہیں جیسے یہ کام ان کے اپنے ہیں اور جب تک بخیر وخوبی طے نہ ہو جائیں یہ چین سے نہیں بیٹھتے۔ شفیق حاجی اور نمازی ہیں۔ مطالعہ کا شوق ہے۔ بریڈفورڈ جمخانہ کے مستقل عہدیدار ہیں۔ اس حیثیت میں جب کسی تقریب میں سٹیج پر آتے ہیں تو مسکراتے ہوئے اقرار کرتے ہیں ''چھوٹا موٹا لیڈر تو ہوں''۔ مختصراً شفیق صاحب قابل احترام شخصیت ہیں۔ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دوستوں کے دوست ہیں۔ پہلے کرکٹ کے کھلاڑی تھے اب ایمپائر ہیں۔ کھیل کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کے بعد ادب و اشاعت کی طرف رخ کیا ہے۔ سب سے پہلے ہمارا جھنڈا بلند کر رہے ہیں۔ ان کی ثابت قدمی، نیک نامی اور نیک نیتی پر بھروسہ ہے۔ خدا ان کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے (آمین)۔ شفیق صاحب کا ادبی رجحان اور میلان جلد وہ رنگ لائے جب شفیق صاحب کی اپنی کہانیوں کا مجموعہ منظر عام پر آئے۔ یقین جانیے ان کے دامن میں بہت سی کہانیاں مچل رہی ہیں۔

مقصود الٰہی شیخ

لاہور 5 مئی 2004

عرض مرتب

میں 1968ء میں پاکستان سوسائٹی بریڈفورڈ کا ممبر بنا تو اس وقت میرا تعارف مقصود الٰہی شیخ سے ہوا۔ بہت عرصہ تک مجھے ان کی افسانہ نگاری کے بابت کچھ بھی معلوم نہ ہوا۔ میں گوجر خان کے ایک قصبے کسرور سے میٹرک کئے بغیر آیا تھا۔ انگریزی اردو دونوں کمزور تھیں۔ شیخ صاحب مجھے کہتے تھے کہ مجھ سے ملنے آؤ تو اردو پڑھ لیا کرو۔ انگریزی کے لئے کالج میں داخلہ لو۔ میں ایک مل میں شفٹ ورک کرتا تھا۔ شفیٹس آدمی کا کچومر نکال دیتی ہیں۔ میں کالج کیسے جاتا؟ شیخ صاحب کی پیشکش سے بھی فائدہ اٹھانے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ ایک بار شیخ صاحب سے ملنے گیا تو اُنہوں نے مجھے ماہنامہ ''افکار'' پڑھنے کے لئے دیا۔ کئی سال بعد ''افکار'' اپنے نام لگوانے کا خیال آیا پھر میں خوبصورت ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی اور بہت دلچسپ ماہنامہ ''شمع'' دہلی پڑھنے لگا۔ بریڈفورڈ میں ایڈیٹر ''شمع'' یونس دہلوی کی ملاقات یاد رہے گی۔ افسوس ہے کہ یہ رسالہ اب بند ہو گیا ہے۔ مقامی طور پر پاکستان سوسائٹی کے بعد مجھے ہفت روزہ ''راوی'' میں دلچسپی ہوئی اور رضا کار بن کر خاصا کام کیا۔ کہنہ مشق صحافی جناب انعام عزیز (مرحوم) بریڈفورڈ آنے جانے لگے تو ان سے واقفیت ہوئی۔ روزنامہ ''جنگ'' لندن اور روزنامہ ''ملت'' لندن کی یارکشائر میں تقسیم کی ذمہ داری سنبھالی۔ بیس سال پہلے ماہنامہ ''انشاء'' کراچی اور سہ ماہی ''ابلاغ'' نوشہرہ کا ممبر بنا۔ آج کل ''شب خون'' الہ آباد بھی لگوالیا ہے۔ شیخ صاحب ''فنون'' بھی پڑھنے کے لئے عنایت کرتے ہیں ان کے بارے میں بہت سے لوگوں کی رائے پڑھ چکا ہوں مگر محترم احمد ندیم قاسمی نے شیخ صاحب پر جو لکھا ہے وہ میرے دل میں اتر گیا ہے۔ قاسمی صاحب سے مجھے اس زمانے سے عقیدت ہے جب ان کا جشن بریڈفورڈ میں منایا گیا۔ میں ایک زمانے میں ان کا کلام ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ اسی طرح جناب ارشد نعیم کا مقصود شیخ صاحب پر مضمون پڑھا۔ میں اس مضمون سے

بہت متاثر ہوا۔ مضمون سے ظاہر ہوتا تھا جیسے نعیم صاحب، شیخ صاحب کو قریب سے جانتے ہیں جبکہ وہ کبھی نہیں ملے۔ یہاں ذکر کردوں کہ ایک زمانے میں جناب موج فرازی مرحوم بھی میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے مشاعروں میں جانے لگا۔ کرکٹ کے علاوہ مشاعرے میں بلند آواز سے داد دینے کی عادت پڑی لیکن شعر کہنا اور افسانہ لکھنا نہیں آیا۔ اس کے علاوہ مجھے کرکٹ کا بہت زیادہ شوق ہے۔ میں نو سال سے بریڈفورڈ سنڈے میوچل سکول لیگ اور سات سال سے ویسٹ یارکشائر قائدِاعظم لیگ میں ایمپائری کے ساتھ یارکشائر کے سب سے پرانے کرکٹ کلب بریڈفورڈ جمخانہ میں مختلف عہدوں پر مسلسل فرائض انجام دے رہا ہوں۔

شیخ صاحب کی کتاب ''من درپن'' کو اردو مرکز انٹرنیشنل لاس اینجلز سے 2002 کی بہترین کتاب کا احمد ادایا ایوارڈ ملا ہے۔ اس کتاب میں شیخ مقصود الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ان کی آخری کتاب ہے۔ دوسروں کا مجھے پتہ نہیں لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا جبکہ شیخ صاحب کے افسانے برابر چھپ بھی رہے ہیں اور جب میں نے ''فنون'' میں ''من درپن'' پر ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا تبصرہ پڑھا ''......'من درپن' مقصود الٰہی شیخ کے 21 افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ لکھنے والا اپنا قلم کبھی نہیں توڑتا۔ زندگی کی آخری سانس تک ہونے والے تجربے اور مشاہدے' جذبات اور محسوسات' واقعات و حوادث 'مختلف عنوانات کے تحت تحریر کے پیرائے میں ڈھلتے رہتے ہیں۔......'من درپن' مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں کا آخری مجموعہ نہیں ہے۔ اردو ادب ان کے نئے افسانوی مجموعے کا منتظر ہے۔'' میں نے ان کے وہ افسانے ان رسالوں سے نکالے جن کو میں مدت سے پڑھتا ہوں۔ یہ افسانے یا کہانیاں شیخ صاحب کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں اور نئے ہیں۔ ان کے ایک مداح جناب ارشد نعیم سے مشورہ کر کے دس افسانے جمع کیے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کی رائے نے مہمیز کا کام دیا

اوران کے وہ افسانے ان رسالوں اور کہانیوں میں جہاں ہیروئین کے حسن کا بیان لکھتے ہوئے
بہت تعریف کی گئی ہے وہاں سے میں نے کتاب کا عنوان چن لیا۔ یہ کسی افسانے کا نام نہیں ہے۔
میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ جرأت اور کوشش کچھ لوگ تو ضرور پسند کریں گے کہ سپورٹس کے ایک
شیدائی نے اپنی طرف سے ادب کی خدمت کی ہے۔

محمد شفیق

بریڈفورڈ، 8 مارچ 2004ء

مقدمہ

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ افسانہ نویسی کا فن بھی صنف ناول نگاری کی طرح انگریزی ادب کے توسط سے برصغیر پاک و ہند میں روشناس ہوا۔ اس صنف کے جملہ فنی اسرار و رموز بھی دساور سے برآمد کیے گئے اور جلد ہی اس خطے کے ادبی ماحول اور علمی فضا میں اپنی عظمت و سربلندی کا پرچم لہرا گئے۔ اس نئی صنف کو متعارف و مستحکم کرنے میں انگریزی افسانوں اور دیگر بیرونی کہانیوں کے مترجمین نے بھی نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ ان سبھوں نے اپنے معرکتہ الآرا ترجموں کے ذریعے برصغیر کے ادیبوں میں افسانہ طرازی کی امنگ پیدا کی، انہیں جدید و مختصر افسانہ لکھنے کے اصول و ضوابط بتائے اور نہایت تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کے پیش نظر اس صنف کے فارمیٹ کی قدر و منزلت سے آگاہ کیا۔

چونکہ غزل مثنوی اور واسوخت کے زیر اثر اور قدیم داستانوں کے چھائے ہوئے اثرات کے نتیجے میں ''رومان'' کی انجانی لہرین ادب اردو میں رواں دواں تھیں، لہذا دساور سے درآمد شدہ افسانوں کے ترجمے بھی کچھ اسی قبیل کے تھے۔..... ایسے کہ آج ایک سو سال کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی ان کے پڑھنے سے الف لیلوی فضا جسم و جان کو مخمور کر دیتی ہے۔ اور اسی رومانوی اثرات کے پیش نظر طبع زاد قسم کے بھی جو افسانے لکھے گئے، وہ بھی سراپائے محبوب کی قصیدہ خوانی سے مملو تھے۔ چاہے وہ سجاد حیدر یلدرم ہوں یا سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری ہوں یا مجنوں گورکھپوری، ل احمد ہوں یا محمد علی ردولوی..... سب کے سب بقول میر

اسی زلف کے اسیر ہوئے

اور ایسے افسانوں کے عنوانات بھی دیکھیے کہ رگوں میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ کیوپڈ اور سائیکی'' ''سمن پوش'' ''نجم السحر'' ''دلہن کی پوشاک''۔

یہی وہ سمن پوش کا ماحول اور نجم السحر کی سحر آفرینی تھی کہ اس صنف ادب میں ایک

زبردست دھماکہ ہوا۔ چند جیالوں کے ہاتھوں ترقی پسند تحریک نے رومان پرور سرمین میں زور پکڑا اور کیا شاعر، کیا نقاد، کیا افسانہ نویس سب ہی اس انقلاب آگیں طوفان کی زد میں آگئے اور رومانوں تارعنکبوت تارتار ہوگیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آدرش کو سامنے رکھ کر جو بھی افسانے اردو میں لکھے گئے وہ تمام تر انسانی زندگی کے تلخ عناصر پر مشتمل تھے۔ ان میں آدم زاد کی زخم خوردہ روحوں کی تڑپ، لامتناہی مصائب، شب و روز کے آلام و افکار، نت نئے سماجی و سیاسی مسائل، غربت و ناداری کی اذیت ناکی، ظلم و جور کے نہ ختم ہونے والے سلسلے، استحصال کے ڈراؤنے مناظر..... ان تمام حالات و کوائف کو صنف افسانہ میں سمونے کی بھرپور کوشش کی گئی اور قصۂ زمین برسرزمین لکھا گیا۔ نیز طبقہ واریت، ذات پات کی تقسیم، سماجی کا گھناؤنا نظام، فرسودہ رسم و رواج کے اندوہناک اثرات کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے اس صنف نثر کو توانائی بخشی گئی۔ ایسے افسانہ نگاروں کے میر کارواں، منشی پریم چند نے جب ''کفن'' تحریر کیا تو اردو ادب کی فضا ہی بدل گئی۔ فانی نے اسی دور میں یہ مصرع کہا تھا:

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اور پریم چند کے یہاں معاملہ ایسی میت کا تھا کو غربت کے ہاتھوں بے کفن پڑی تھی کہ اس مقصد کے لئے مانگے تانگے کی رقم پیٹ کی آگ بجھانے میں صرف ہوگئی تھی۔ گویا ''کفن'' اردو افسانہ نگاری میں زبردست بھونچال تھا جس نے سبھوں کے ہوش و خرد تمام کر دیئے۔ لکھنے والوں کو ایک ایسی راہ بجھائی دے گئی جو ''منزل مقصود'' تک جاتی تھی۔ مگر جس کے دونوں جانب حرماں نصیب انسانوں کے درس اور بے جان لاشے تھے، تہی دست و تہی داماں!

غرض، بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے اردو ادب کے افسانوی ادب میں جو زلزلے آتے رہے، جو ہلچل جنم لیتی رہی، جو کربناکیاں اس میں حلول کرتی رہیں، جو مسائلِ زندگی

عنوان بنتے رہے۔ ان سب عناصر نے اس صنف کو مغربی ادب کے مقابل کھڑا کر دیا.... وہ مغرب جو کبھی ہم سبھوں کا استاد تھا، ہمارا رہبر تھا، ہم جس کے خوشہ چیں تھے، رہین منت تھے .... اب اس کے بالمقابل کھڑے تھے۔ ان دراز قد فنکاروں میں ''انگارے'' کے خالقین (احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود اظفر) ہی نہ تھے۔ بلند پایہ افسانہ نگاروں کا ایک جم غفیر تھا جن کی نگاہیں عمیق تھیں، جن کا شعور بے رنگ تھا، جن مطالعہ وسیع تھا، جن کا مشاہدہ گہرا تھا، جن کی قوتِ حس فزوں تھی اور جن کے دلوں میں انسان دوستی کی رم جھم برس رہی تھی۔ ان لکھاڑیوں میں کرشن چندر سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک انور سے لے کر انور عظیم تک، عصمت چغتائی سے لے کر ہاجرہ مسرور تک .... سینکڑوں افسانہ نگار تھے جنھوں نے اپنی بصیرت، اپنی فکر، اپنی سوچ، اپنے فن، اپنے اپروچ اور اپنے مشاہدے کے بل بوتے پر ایسے ایسے شہہ پارے پیش کئے کہ اہل مغرب دنگ رہ گئے۔

حصول آزادی کے بعد اس صنف ادب میں پھر ایک نیا موڑ آیا .... مہاجرت و فسادات کے نتیجے میں! ان دل خراش مناظر کو، روح فرسا لمحات کو، انسان کی بے بسی و بے سروسامانی کو جس چابکدستی سے اردو کے افسانہ نگاروں نے رقم کیا، اس کی مثال دنیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی! گویا، اردو زبان کے ان فنکاروں نے اہل دنیا کو بہ بانگ دہل یہ باور کرادیا کہ ''کیوپڈ اور سائیکی'' اور ''سمن پوش'' جیسے افسانوں کے بعد محمل لیلیٰ کا رخ کسی اور ہی سمت ہو گیا ہے کہ اب تا حد نظر ابن آدم کی برہنہ لاشوں پر زاغ و زغن کے منڈلاتے ہوئے غول نظر آرہے ہیں۔

مذکورہ مہاجرت و فسادات کے زخم ابھی مندمل بھی نہ ہو پائے تھے کہ .... ایک دوسری ہجرت کا آغاز ہو گیا۔ برطانوی دور میں ''سات سمندر پار'' کی اصطلاح سننے میں آیا کرتی تھی۔ لیکن اب یہی روز کا معمول بن گئی۔ جسے دیکھو امریکہ و برطانیہ اور جرمنی و آسٹریلیا کیلئے پر تول رہا

ہے.... آباء واجداد کی دہلیز چھوڑ کر، اسلاف کی اقدار وروایات کو تیاگ کر.... صرف اور صرف روزی کمانے کیلئے سرگرم سفر ہونا، اور پھر دیارِ غیر میں بس جانا.... ایک نیا موضوع بن کر سامنے آیا۔ ایسا موضوع جس کے پس پردہ بے شمار عوامل کارفرما تھے۔.... بچپن کی معصوم انگنائی، نوجوانی کی سرور آمیز پگڈنڈیاں، اہل خاندان کی گرم جوشی مرکزِ جاناں کا لمس، سرِ بام آنچل کی ہوائیں، منڈیروں پر بکھرتی چاندنی، ان تمام دلکش ودلفریب عوامل سے یکلخت کنی کاٹ کر ایسے ماحول میں زندہ رہنے کو ترجیح دی گئی، جہاں بقول اکبر الہ آبادی:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے

لیکن اسی لسان العصر کے الفاظ میں

لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

خون کی عدم موجودگی کے باوجود اس دساوری قیام وطعام میں زندگی کی شادمانیوں کے ساتھ روح کا جو گہرا زخم پوشیدہ تھا، کلچر کی ٹوٹ پھوٹ کے جو اثرات پنہاں تھے، ذہن ودل کی جو کرختگی اندر ہی اندر جنم لے رہی تھی.... وہ سب کچھ ایک نیا موضوع بن کر نہایت شدومد کے ساتھ اردو افسانے میں در آیا تھا، مگر بہ انداز دگر! اس قبیل کے لکھاڑیوں میں وہ افسانہ نگار نہ تھے جو وطن کی شادکامیوں سے کام ودہن کو لذت آشنا کر رہے تھے۔ وہ بھی نہ تھے جو "تقریب رونمائی" کے ناطے پیہم دیارِ غیر کے سفر میں رہتے ہیں۔ وہ بھی نہ تھے جو خیال کے گھوڑے دوڑا کر جھوٹی سچی بات کہہ لیتے ہیں.... بلکہ وہ افسانہ نگار تھے جنہوں نے واقعتاً ہجرت کی تھی۔ جنہوں نے ماں باپ کی دہلیز چھوڑ دی تھی۔ جنہوں نے خاک وطن کی خوشبو سے تہی داماں ہو کر دور بہت دور دیارِ غیر میں ڈیرا جمایا تھا۔ جن کی قدیم تہذیب تڑخ رہی تھی۔ جن کا کلچر زبوں بوس ہو رہا تھا۔ جن کی اقدار و

روایات مٹ رہی تھیں۔ جنگی تہذیب کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ مگر وہ ہجرت پر مجبور تھے (یا کر دیئے گئے تھے)۔

سب سے الگ سب سے جدا سب سے منفرد یہ قافلہ ایسے افسانہ نگاروں کا تھا جو شامِ تنہائی میں حضرت وحید الہ آبادی کا یہ شعر زیرلب پڑھتے اور نم آلود پلکوں پر دساوری پرفیوم سے تر ریشمی رومال رکھ لیتے:

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وادیٔ غربت کی المناکیوں اور دیارِ غیر کی حرمانصیبوں صفحۂ قرطاس پر جیتے جاگتے انداز میں پیش کرنے والے دساوری افسانہ نگاروں میں نمایاں نام مقصود الٰہی شیخ کا ہے۔ وہ پاکستان کی سرزمین میں زندگی کی متعدد بہاریں دیکھ کر عازمِ لندن ہوئے.... مگر ان کا ''انداز'' ''وطیرہ'' اور ''نظریہ'' اکبر الہ آبادی کے ''عشرتی'' جیسا ہرگز نہ تھا، یعنی:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا، عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پرواہ نہ رہی
چکھ کے کیک، سویوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پہ کچھ ایسی طبیعت پگھلی
گلشنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

مقصود صاحب نے خاکِ وطن کی خوشبو کو مشامِ جاں میں سموئے رکھا، اجداد کی دہلیز کے سرمے سے آنکھوں کو سجائے رکھا اور بچپن و جوانی کی سہانی یادوں کے پھول دل کے چمن میں کھلائے رکھا۔ بقول فیض:

یادوں کے پھول سوکھ نہ جائیں اسی لئے
آنکھوں کو اشک بار کیا ہے کبھی کبھی

مگر شیخ صاحب کبھی کبھی نہیں، مسلسل ومتواتر اپنی آنکھوں کو اشک بار کئے ہوئے ہیں۔ وہ دورِ جدید کے ایسے افسانہ نگار ہیں جو راتوں رات شہرت و ناموری کی ''پوٹلی'' کے حقدار نہیں بنے ہیں۔ وہ گذشتہ چالیس سال سے لکھ رہے ہیں۔ یہ چالیس کا عدد کوئی کھیل نہیں.... تپسیا ہے، ایک جوگ ہے، ایک ریاض ہے، جس سے موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی گزرے اور اصحاب کہف جیسے عباد الصالحین بھی! مقصود الٰہی کسی دو صفحاتی رسالے میں لکھ کر ''داد'' کے ڈونگرے کے سزاوار نہیں ٹھہرے۔ وہ اردو کے صف اول کے رسائل میں افسانے لکھتے رہے ہیں۔ ان کی تحریری کاوشوں کو احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، جوگندر پال، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر مظفر حنفی جیسے بلند پایہ ادیبوں نے سراہا ہے اور نگاہ عزت وتوقیر سے دیکھا ہے۔

مجھے تو مقصود الٰہی شیخ نہ صرف دساور کے افسانہ نگاروں میں ممتاز نظر آئے بلکہ برصغیر کے موجودہ افسانوی لکھاڑیوں میں بھی منفرد دکھائی دیئے.... اس لئے کہ وہ کسی مخصوص آدرش کے پرچارک نہیں، وہ کسی ''لابی'' کے ''ڈھول'' بھی نہیں! وہ ''ذات پات'' کے خول میں کبھی اسیر بھی نہیں رہے۔ وہ ''ما و من'' کے نظریے کے غلام بھی نہیں بنے۔ ان کا نظریہ وہی ہے جس کی بابت علامہ اقبال کہہ گئے:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

خدا کے بندوں کے ساتھ اس ''پیار'' میں کوئی امتیاز نہیں، کوئی علاقائیت نہیں، کوئی طبقہ واریت نہیں، رنگ ونسل کی کوئی شناخت نہیں۔ ان کا نظریہ زندگی وہی ہے جس کی بابت کبیر داس سالہا سال قبل کہہ گئے ہیں:

کبیر کھڑا بجار میں مانگے سب کی خیر

نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

اسی جذبے نے مقصود الٰہی شیخ کی نگاہ میں وسعت، اُن کے دل میں عمق، ان کے ذہن میں آفاقیت، ان کی قلم میں جولانی، ان کی سوچ میں گہرائی اور ان کے خیالات ومحسوسات میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔

مقصود الٰہی اس دور کے ایسے بلند پایہ افسانہ نگار ہیں جن کی تخلیقات ادبی رسائل ہی کی زینت نہیں بنی ہیں، متعدد کتابی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ مثلاً ''جھوٹ بولتی آنکھیں'' ''پتھر کا جگر'' ''برف کے آنسو'' ''پلوں کے نیچے بہتا پانی'' اور ''من درپن''! یہ سارے کے سارے مجموعے داخلی احساسات وعوامل، بیرونی معروضات ومظاہر، الفاظ وعبارت آرائی کے درمیان شعوری ولاشعوری ہم آہنگی کا سنگم نظر آتے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ نے واقعہ نگاری، کردار سازی اور مکالمہ نویسی کو روایت در روایت کے اصول وضوابط کے تابع نہیں رکھا بلکہ اپنی ذاتی اُپج نئی تکنیک کے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں کئی نسلوں کی رام کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ تین جہتیں فطری ٹکراؤ کی آماجگاہ ہیں، بکھراؤ کے کرب انگیز مناظر ہیں، اقدار وروایات کے بے ربط وبے مرکز ہونے کی دلیل ہیں۔ ان کے افسانوں میں ابن آدم غاروں والا نہیں اسی دھرتی پر بسنے والا البشر ہے۔ یہ عریاں بھی ہے اور منقش و دیدہ زیب لباس میں ملبوس بھی! یہ مسجد کی سیڑھیوں پر ''دے بابا'' کی رٹ لگانے والی فقیرنی بھی ہے اور دولت میں تلنے والے افراد بھی! ان کے افسانوں میں سماج کے گھناؤنے پن کی جیتی جاگتی تصویر کچھ اس طرح ہویدا ہے کہ ''ہم سب اس حمام میں...... '' کی مثال معلوم ہوتے ہیں۔

غرض مقصود الٰہی شیخ نے جو کچھ لکھا ہے، اپنی دور بین نگاہوں سے منظرنامہ دیکھ کر لکھا ہے، اپنے جسم وجاں کے لمس کے ذریعے انسانوں کو ٹٹول کر اور اس کے کرب کو محسوس کر کے لکھا

ہے، اپنے دل کی دھڑکنوں سے سن گن لے کر لکھا ہے.... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی تخلیقات ''مانگے تانگے'' کا احساس نہیں دلاتیں بلکہ سب کی سب طبع زاد ہیں اور ان کا پس منظر یہ ہے:

میں خونِ حسرت کی سرخیوں سے تمہارے عارض نکھار دوں گا

میں خود پریشاں رہوں گا لیکن تمہارے گیسو سنوار دوں گا

گذشتہ چار عشروں سے ''عارض محبوب'' نکھارنے اور ''گیسوئے جاناں'' سنوارنے والا یہ فنکار جب برملا یہ اعلان کرے:

''یہ (من درپن) میرے افسانوں کا آخری مجموعہ ہے''

تو پھر عارض محبوب کس طرح نکھریں گے اور گیسوئے جاناں کس طرح سنوریں گے۔ یہ ذہن میں (ہم سب کے) ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ مقصود الٰہی شیخ نے یہ بات 2002ء میں ڈنکے کی چوٹ پر کہی تھی اور سبھوں نے سنی تھی۔ ہندوستان والوں نے بھی اور پاکستانیوں نے بھی! برطانیہ و امریکہ میں بسنے والوں نے بھی!.... انہوں نے بھی جو ''راوی'' کے ذریعے اپنا قد کاٹھ اونچا کرتے رہے.... انہوں نے بھی جو ''مخزن'' کے ذریعے شہرت و مقبولیت کے ڈونگرے بٹورتے رہے۔ ہم سب اردو داں نے سنی، قلم کے دھنی نے سنی.... مگر کسی نے بھی مذکورہ دھماکہ خیز ''جملے'' پر دھیان نہ دیا مگر توجہ دی تو کس نے دی؟ خطہ پوٹھوہار کے ایک دیہی نے، ایک محنت کش نے، ایک عام سے انسان نے۔ اس نے، جس کا قلمکاری سے رشتہ بھی نہیں.... مگر جو مطالعہ کا دھنی اور پڑھنے کا متوالا ہے۔ جب اس شخص نے مقصود کے مذکورہ بالا جملے کو پڑھا تو چیخ کر بولا:

''مجھے یہ اچھا نہیں لگا''

اسی اچھا نہ لگنے والے جذبے نے محمد شفیق صاحب کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اس دور

کے ممتاز و منفرد افسانہ نگار جناب مقصود الٰہی شیخ کے ان افسانوں کا کھوج لگائیں جو اردو کے مختلف رسائل میں تو چھپ چکے ہیں، مگر کتابی صورت میں سامنے نہیں آئے۔ ''کھوجنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے'' کے مصداق مرتب کتاب ہذا نے ایسے دس افسانے ان رسالوں سے نکالے جنہیں ایک پھوٹوہاری جیسے پڑھا کو نے پڑھ رکھے تھے اور چونکہ یہ شیخ صاحب کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں، لہذا بقول مرتب ''نئے'' ہیں اور آپ بھی انہیں ''نئے'' سمجھ کر پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ کتنے قد آور کتنے جاذب نظر کتنے معیاری اور کتنے معرکتہ الآرا ہیں.... یہ سب بلا ریب ''قلم الٰہی'' کا ہی اعجاز ہے۔

میں اپنے اس اوٹ پٹانگ مقدمے کو منزل اختتام تک پہنچانے کے لئے محمد شفیق صاحب کی چنیدہ درج ذیل رائے کا سہارا لے رہا ہوں جس کی مثل کوئی جملہ دنیا کے کسی ادب میں مجھے نہیں ملا ہے:

> ''لکھنے والا اپنا قلم کبھی نہیں توڑتا۔ زندگی کی آخری سانس تک ہونے والے تجربے اور مشاہدے، جذبات اور محسوسات، واقعات و حوادث، مختلف عنوانات کے تحت تحریر کے پیرائے میں ڈھلتے رہتے ہیں''۔

مجھے امید ہے شیخ صاحب اپنے عزیز دوست شفیق ہی کی نہیں، ہم پرستاران ادب کی خواہش کو ملحوظ رکھنے اور نئے نئے شہ پاروں سے اردو افسانے کا دامن وسیع کرنے کی سعی فرماتے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

جمعۃ المبارک، 14 مئی 2004ء

مہجری ادیب

اردو کا برطانیہ سے نہایت قدیمی رشتہ ہے۔ برصغیر سے جن لوگوں نے ہجرت کر کے لندن میں اقامت اختیار کی' اُن میں سے بیشتر افراد نے اپنی زبان اور تہذیب کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ میر محمد حسین لندنی اور دوسرے کئی نام ایسے ہیں جنہوں نے برطانیہ میں رہ کر اُردو کے چراغ کو جلائے رکھا۔ برطانیہ کا سورج گو غروب ہو گیا ہے مگر وہاں اُردو کا ایک ایسا سورج طلوع ہوا ہے جو تا قیامت تابندہ رہے گا۔

برطانیہ میں مقیم مہاجر ادبا انگریزی ادبیات سے آگہی کے باوجود اپنی تہذیب اور زبان کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں' یہ بڑی اچھی بات ہے۔ باوجودیکہ انگریزی میں لکھنے کے تجارتی اور معاشی فوائد بھی ہیں مگر یہ وہ اُردو کے سچے عاشق ہیں جو سود وزیاں کی پرواہ، کسی منفعت کی خواہش کیے بغیر اپنی زبان کے دائرے کو نہ صرف وسعت بخش رہے ہیں بلکہ برطانیہ کی فضا میں اُردو کا پرچم لہرا رہے ہیں۔

مقصود الٰہی شیخ بھی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو تقریباً تیس چالیس برسوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور وہاں نہ صرف متحرک اور فعال ہیں بلکہ اُردو مشن کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ وہ ہر سطح پر اپنی زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ نہ اُنہیں ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ! بس ایک عشق ہے اپنی زبان سے جو وہ یہ کارِ خیر دیارِ غیر میں انجام دے رہے ہیں۔ 'مخزن' تو ایک ایسا ادبی انتخاب ہے جس پہ بہت سے لوگوں کو رشک ہو سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تخلیقات ہوتی ہیں بلکہ ساتھ میں تجزیے بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے جو مخزن کے ذریعے فروغ پا رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مقصود الٰہی شیخ مخزن کے ذریعے ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دے رہے ہیں اور برطانیہ کے ادیبوں سے برصغیر اور پاکستان اور دیگر ممالک کے

ادیبوں کو متعارف کرا رہے ہیں۔ اس کام کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ مخزن اور راوی تو خیر اُن کی ادبی فتوحات کا نشانِ امتیاز ہیں ہی۔ اُس کے علاوہ اُن کی ایک حیثیت معتبر افسانہ نگار کی بھی ہے۔ انہوں نے اب تک جو افسانے لکھے ہیں، وہ بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ نے چونکہ کئی تہذیبوں کا مشاہدہ کیا ہے اور دیارِ غیر میں مقیم ہیں اس لیے اُن کا وژن بھی وسیع ہے۔ اُن کی کہانیوں میں کئی تہذیبوں کے رنگ نظر آتے ہیں مگر اپنی تہذیب پر اصرار بھی ہے۔ اُن کے افسانوں میں جو تہذیبی تشخص ہے وہ اُس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی مٹی اور ثقافت سے جڑے ہوئے فنکار ہیں۔ کسی بھی مرحلے پر وہ اپنی مٹی کو فراموش نہیں کرتے۔ دیارِ غیر میں ہزاروں مسائل ومصائب ہوں مگر اپنی تہذیب، ثقافت اور مٹی سے وابستگی کا یہ جذبہ اُن سے ایسی کہانیاں لکھواتا ہے جس میں اپنے ملک کی فضا ہوتی ہے اور اپنی مٹی کی محبت۔ یہی دراصل سب سے بڑی چیز ہے کہ انسان چاہے دنیا کے کسی خطے میں بس جائے مگر اپنی سنسکرتی، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو فراموش نہ کرے۔ مقصود الٰہی شیخ نے کئی ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ ''شیشہ ٹوٹ جائے گا'' اُن کا ایسا ہی ناولٹ ہے جس میں تارکین وطن کی جدوجہد کی پوری کہانی ہے اور کئی تہذیبوں کے منتھن سے ایک ایسا خوبصورت منظر نامہ تعمیر کیا ہے کہ وہ قاری اُس منظر نامے میں مسحور اور مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ 'دل ایک بند کلی' بھی ایک ایسا ہی ناولٹ ہے، جس کا کینوس بہت وسیع ہے۔

مقصود الٰہی شیخ سوچا جائے تو مہجری ادیب ہیں اور مہجری ادب کے جو امتیازات اور نقوش عالمی افق پر مرتسم ہو رہے ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری آنے والی صدیوں میں اُن تخلیق کاروں کو زیادہ حیثیت حاصل ہو گی جو اجنبی منطقے میں رہ کر بھی اپنی زبان اور تہذیب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور دوسروں کی ادبیات، تہذیب مسائل اور مباحث سے اپنے وژن کو وسیع کرتے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کی کہانیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ کہانی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ ظاہری سطح پر کہانی کچھ اور ہوتی ہے، باطنی سطح پر کچھ اور کہانی کی کئی سطحیں انہیں دوسرے

فنکاروں سے ممیز بھی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ مقصود الٰہی شیخ کہانی کہنے کے فن میں مشاق ہیں اور اُس افسانوی تکنیک کو اپناتے ہیں جو الف لیلیٰ کی شہرزاد کی تکنیک تھی یعنی کہانی در کہانی۔ یہی وجہ ہے اُن کی طویل کہانیوں سے بھی بوریت یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک دلچسپی سی بنی رہتی ہے۔ اُن کا اسلوب بھی انتہائی سادہ اور شگفتہ ہے کہ قاری کو سحر میں باندھے رکھتا ہے۔

ابھی میں نے اُن کی دو کہانیاں پڑھیں۔ 'طرز تغافل نہ عرض تمنا' اور دوسری 'سچ مچ' ایک کہانی تو بالکل نثری نظم کے انداز کی لگی وہ کہانی ''سچ مچ'' تھی۔ انہوں نے یہ کہانی شاعرانہ اسلوب میں لکھی ہے، شعری نثریت نے اس کہانی کو بہت بلندی عطا کی ہے۔

دوسری کہانی 'طرز تغافل نہ عرض تمنا' بادی النظر میں رومانی کہانی لگتی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اس میں بالکل مختلف طرح کی رومانیت ہے۔ اُن رومانی افسانہ نگاروں کی طرح نہیں ہے جو محض لب ورخسار کی باتیں کرتے ہیں بلکہ اس رومانیت میں وہ باطنی مظہریت ہے جس کا اکتشاف کئی بار افسانے کی قرأت کے بعد ہوتا ہے۔ ''رُت آئے رُت جائے'' ''موہے پیا ملن کو جانا'' اور اس طرح کے بہت سارے افسانے ہیں جو مقصود الٰہی نے ایک مخصوص تہذیبی تناظر میں لکھے ہیں اور اپنی مٹی اور دیارِ غیر کے کلچر کے مابین تصادم کی تخلیقی تعبیر پیش کی ہے۔

برطانیہ میں مقیم زیادہ تر مہاجرین ادبا جن مسائل سے جوجھ رہے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا مسئلہ اپنی تہذیب اور زبان کا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ وہاں کے ادبا نے تہذیب اور زبان کی سطح پر کسی طرح کی مصالحت یا مفاہمت نہیں کی بلکہ وہ اپنی تہذیب اور زبان کے تشخص اور بقا کے لیے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ تہذیبی اور لسانی سطح پر جو کام کر رہے ہیں وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ہمارے لیے لائق تقلید بھی ہے۔ ہمیں مقصود الٰہی شیخ کے جذبے سے اکتسابِ نور اور انسپائریشن حاصل کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے جس جذبے اور خلوص کے ساتھ اُردو کی خدمت کی ہے تھوڑی سی خدمت ہم اُس مٹی میں بھی کر لیں جہاں اُردو زبان نے پرورش پائی ہے اور

پروان چڑھی ہے تو اُردو کا مستقبل کبھی تاریک نہیں ہوگا۔ اُردو کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا کسی ایک خطّے میں اردو کا چراغ اگر بجھ بھی جائے تو اردو کے لئے پوری دنیا میں ہزاروں خطّے ایسے ہیں جہاں اس کے عاشق کبھی بھی اسے بجھنے نہیں دیں گے۔ اُردو نے پوری دنیا کو اپنا اسیر کرلیا ہے اور ایک عالم گیر آفاقی زبان بن گئی ہے۔ دنیا کے ہر خطّے میں کوئی نہ کوئی ایک اردو بولنے والا ضرور موجود ہے اور جب تک مقصود الٰہی شیخ جیسے اُردو کے سچے جانباز اور جاں نثار موجود ہیں' اُردو کا چراغ دنیا کے ہر ایک خطّے میں جلتا رہے گا۔ بس آیئے ہم لوگ اُردو کی شمع کو ہر طرف روشن کرنے کی کوشش کریں کہ یہی وہ گنگا جمنی زبان ہے جو نفرت کی آندھیوں میں بھی روشنی بانٹ سکتی ہے۔ برطانیہ میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا اس زبان سے اکتسابی تعلق ہے مگر جنہیں اُردو سے حد درجہ عشق ہے اور پوری دنیا میں اُردو کے چاہنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو یہ اس زبان کے جادو کا اثر بھی ہے اور اُس کے سچے عاشقوں کی دعاؤں کا بھی' کوششوں کا بھی اور یہ عاشق کس قریئے' کس نگر میں ہوں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ کسی جھونپڑی میں بھی ہو سکتے ہیں' کسی کٹیا میں بھی۔ کسی عالیشان محل میں بھی ہو سکتے ہیں اور انہیں لوگوں کی وجہ سے اردو زبان کا چراغ روشن ہے۔ جس کو قتل کرنے کی سازشیں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ مگر یہ زبان بھی بڑی سخت جان ہے کہ ہزاروں مصائب اور موجِ حوادث کے باوجود روز بروز اپنا دائرہ بڑھاتی ہی جارہی ہے اور اقلیموں کو فتح کرتی جارہی ہے۔ یہ اس کی شیرینی اور سادگی کا اثر ہے کہ اِس زبان نے اپنے دائرے کو سمٹنے نہیں دیا بلکہ اپنے دائرے کو بڑھایا ہی ہے۔ برطانیہ میں بڑھتی ہوئی اردو آبادی اور دیگر یورپین ممالک میں اردو کی جلتی ہوئی شمع اس کا ثبوت ہے۔

صلاح الدین پرویز

ایڈیٹر "استعارہ"، 53-A, Zakir Bagh, Oakla Road, New Delhi-25

دہلی، 26 اپریل 2004ء

مقصود الٰہی شیخ کی فنی تکمیل

تخلیق کار، تخلیق اور قاری یہ تینوں مل کر ادب کے عمل کو جاری وساری رکھتے ہیں۔ قارئین کی بھی کئی اقسام ہیں، بعض محض تخلیق سے سروکار رکھتے ہیں، بعض تخلیق کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض تخلیق کے ذریعے تخلیق کار کے اندر موجود کشمکش تک پہنچے کی سعی کرتے ہیں۔ جب تخلیق کے انکشاف کا عمل مکمل ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنے تجربہ میں، اپنے انکشاف میں دوسرے قارئین کو بھی شامل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ قارئین کی آخری قسم نہ صرف تخلیق کی مختلف جہات کو منظر پر لاتی ہے بلکہ تخلیق کار کے لیے ایک ایسا احساس فراہم کرتی ہے جس کی موجودگی میں تخلیق کا عمل آسودگی بانٹنے لگتا ہے۔

محمد شفیق خطہ پوٹھوہار کے فرزند ہیں، وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو ایک اچھی تخلیق کے اندر زندگی بسر کرنے کو مالی آسودگی اور تعشیات کے حصول پر فوقیت دیتی ہے، وہ گوجرخان کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے ہیں اس خطہ کے لوگوں کے خمیر میں شعر وادب شامل ہوتے ہیں۔

مجھے آفس میں ایک روز ان کا فون موصول ہوا اور انھوں نے فرمایا کہ میں مقصود الٰہی شیخ کے غیر مطبوعہ افسانوں کو کتابی شکل دے رہا ہوں میں نے یوتھ کان ٹیکٹ (Youth Contact) کے شمارہ میں ان کے افسانوں پر آپ کا تنقیدی نوٹ پڑھا ہے میری خواہش ہے کہ اس کا ابتدائیہ آپ لکھیں۔

میں خود یہ کام کرنا چاہتا تھا کہ مقصود الٰہی شیخ کا فن گذشتہ چالیس برس کی ریاضت سے اس سطح پر ہے جہاں اس کا تجزیہ وتسلیم ہم پر فرض ہے۔

افسانوں کا جو مسودہ انھوں نے بریڈفورڈ سے بھجوایا تھا وہ مجھے نہ ملا، کہیں ڈاک میں کھو گیا۔ اس صورت حال سے محمد شفیق صاحب خاصے مایوس تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کی

وساطت سے یہ مسودہ دوبارہ مجھے بھجوایا تو میں نے اپنی ساری مصروفیات کو ترک کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ آیئے اب ہم مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں کی دنیا میں چلتے ہیں:۔

مقصود الٰہی شیخ چالیس برس سے افسانہ کی صنف کو مالا مال کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ اب وہ اپنے فنی سفر کے اس مقام پر ہیں جہاں تخلیق کار کے ہاں اسلوب، طرز تحریر اور فنی ترجیحات کے حوالے سے تکمیلی صورت ابھر آتی ہے۔ تخلیق کار اس دوران کئی طرح کے تکنیکی اور فنی تجربات سے گزرتا ہے، بہت سی آوازیں اس کے اندر ابھرتی ہیں، بہت سے طرز تخلیق اور اسالیب اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں، بہت سے ادبی رجحانات اور تحریکات اُسے متاثر کرتی ہیں۔ وہ اس دوران زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور بالآخر تلاش کے اس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے جو اس کے اندر پوشیدہ انفرادیت کی تلاش کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اپنے اندر کی انفرادیت کی تلاش اور اس کے حوالے سے الگ راستہ کی ایجاد کسی بھی فنکار کی فنی زندگی کی معراج ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں کو اپنی تصویروں میں سمونے کے لیے کسی منفرد سانچے کی تعمیر دراصل تلاش ذات کے عمل سے مشابہ ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے زیر نظر افسانے اس امر کے غماز ہیں کہ وہ افسانے کے حوالے سے اپنا الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ افسانے کے موضوعات، تکنیک اور فن کے حوالے سے بھرپور رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میرے لئے افسانہ ایک حقیقت ہے، زندگی کی ضرورت ہے، افسانے کے ذریعے ہی زندگی کی بابت شعور حاصل ہوتا ہے، علم سے ادب اور ادب سے انڈرسٹینڈنگ پیدا ہوتی ہے اور یہ زندہ فکر کسی دوسرے شعبہ علم کو میسر نہیں آئی۔''

(ابتدائیہ پلوں کے نیچے بہتا پانی)

مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں میں زندگی کے بکھراؤ کو سمیٹنے کا احساس نمایاں نظر آتا ہے، وہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے میں مگن نظر آتے ہیں، ان کے باطن کی دردمندی اور گہرا احساس مختلف کرداروں کی صورت میں ان کے افسانوں میں ابھرتا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے ہاں حقیقت نگاری اسی سادگی اور روانی کے ساتھ نمودار ہوتی ہے جو ہمارے ہاں کی زندگی کا خاصہ ہے کیونکہ زندگی میں ایسے بڑے بڑے واقعات کم کم ہی رونما ہوتے ہیں جو سارے منظر کو درہم برہم کرنے پر قادر ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بالعموم زندگی بڑی سادگی اور تسلسل کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانے زندگی کی اسی سطح کو ہمارے سامنے لاتے ہیں، جس سے ہم روز و شب گزر رہے ہیں، ان میں غیر معمولی مدوجزر کی کیفیت موجود نہیں بلکہ ایک قافلہ ہے کہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے جا رہا ہے، ایک مسافر تھکن سے چُور ہو کر بچھڑتا ہے تو ایک تازہ دم راہرو اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی بہت آگے جا رہا ہے اور کوئی گردِ کارواں میں گُم سُم راستے کی دھول بننے پر مجبور ہے۔ اس کے باوجود قافلہ ہے کہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ادب اور آرٹ میں ہر نئی سیاسی و جغرافیائی تبدیلی کسی نئے رجحان، کسی نئی تحریک یا کسی نئے ذائقے کا اضافہ کرتی ہے، کسی نہ کسی سطح پر اسے نیا اندازِ فکر دیتی ہے، ہمیں نئی دنیاؤں سے متعارف کرواتی ہے، نئی طرح کے غم اور نئی طرح کی خوشیاں ہمارے دامن میں بھرتی ہے۔ تلاشِ رزق میں سمندر پار جانے والے پاکستانی ادیبوں نے ہجرت کے جس دکھ کو جھیلا وہ اس آسودگی سے بڑھ کر تھا جس کے عوض انھوں نے وطن کو چھوڑا تھا۔ مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے مابین ایک بڑی خلیج حائل ہے اس کو پاٹنے کے لیے سب کچھ تیاگنا پڑتا ہے۔ اپنی روایات، اخلاقیات کو چھوڑ کر نئی اخلاقیات کو اپنانا پڑتا ہے اور یہ ہجرت سے بھی بڑا غم ہے۔ دو تہذیبوں کے درمیان کسی انسان کا معلق ہو کر رہ جانا ایک نئی کشمکش کو جنم دیتا ہے۔

انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ اپنی نئی نسل کو اپنے آدرش اور نظریات کا پیکر دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے مگر ایک اجنبی تہذیب میں پرورش پانے والی نسل پرانی تہذیب کی زنجیر سے بندھی ہوئی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ کسی ایسی قید کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی ہی نئی نسل کو اپنے نظریات' اخلاقیات' مذہب اور معاشرتی معیارات کو بیک جنبش نظر مسترد کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ نے دو تہذیبوں کے درمیان اٹکے ہوئے انسانوں کی باطنی کشمکش اور کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے اسلوب کا خاص کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے اس کے پیچ و خم سے افسانے کی فضا تعمیر کرتے ہیں، وہ کرداروں کی اندرونی کشمکش کو کلیدی حیثیت میں پیش نہیں کرتے بلکہ یہ کشمکش ہمیں خارجی حالات کے زیر اثر ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں کہانی سنانے کا انداز نظر آتا ہے۔ کسی داستان گو کی طرح وہ ہر افسانے میں واحد متکلم کی صورت موجود ہوتے ہیں، وہ پہلے ہمیں مختلف کرداروں سے متعارف کرواتے ہیں، پھر کہانی کی مختلف جزئیات کے پھیلاؤ کو آہستہ آہستہ سمیٹتے چلے جاتے ہیں، ان کے ہاں کہانی سادگی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے مگر وہ اسی دوران اپنے کرداروں کی زبانی ایسے گہرے فکری جملے کہلواتے ہیں کہ ماضی کی یادیں ہمارے دل و دماغ پر نئے نئے نقش ابھارنے لگتی ہیں۔ ماضی کے ساتھ وابستہ دھند میں لپٹے ہوئے کئی منظر' کئی چہرے' کئی المیے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ''دست تہہ سنگ'' میں نہ صرف سقوط ڈھاکہ کا المیہ علامتی سطح پر بیان کیا گیا ہے بلکہ پاکستان میں سیاسی آزادیوں کی تاریخ پر بھی بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تارکین وطن کا المیہ یہ ہے کہ وہ گھر سے بہتر زندگی کا خواب لے کر نکلتے ہیں۔ اس امید پر کہ روپے کما کر وطن واپس لوٹ جائیں گے مگر پھر ان کی زندگی ایک ایسی زنجیر سے بندھ جاتی ہے جو کبھی نہیں کھلتی بلکہ یہ زنجیر ان کی حرکت کو محدود سے محدود تر کیے جاتی ہے۔ ''بازدید'' اسی المیہ کا

اظہار ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ باقی افسانوں سے ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں نئے افسانوی تجربات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

''بازدید'' میں مغربی کلچر کی جنسی آزادیوں کا بیان ہے، جن کو یہاں سے گئے ہوئے لوگ کڑوا گھونٹ سمجھ کر بھی گلے سے نہیں اتار سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، ان کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ ''بازدید'' کا واحد متکلم اسی قسم کے حادثہ کا شکار ہوتا ہے۔

> ''میں کوشش کے باوجود اپنے دوست کو نہ بتا سکا کہ مجھے ہنوز کیسے کیسے ذہنی صدموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیا میں ہمایوں کو وہ کہانی سناتا کہ میں خوشی خوشی فیونا کی راڈا (RADA, Royal Academy of Dramatic Arts) سے سند پانے کے بعد، پہلی فلم سائن ہونے پر اس کے ہمراہ اسٹوڈیو گیا تھا۔ میں فیونا ہی کی طرح خوش تھا اور اتنا ہی پر جوش تھا۔ پہلا شوٹ (شوٹنگ) تھا' ایک پارٹی کا منظر فلمایا جانا تھا سب کے بیچ، سب کے ساتھ مگر سب سے نمایاں ایک جوڑا موسیقی کی لہروں میں تھرک رہا تھا، اچانک ایک نوعمر (kissogram) لڑکی آتی ہے اور بے تکلفی سے بے لباس ہو کر مرد کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لیتی ہے، میں فیونا کو اس رول میں دیکھ کر بڑا غضبناک ہوا تھا مگر مجھے ''سمجھایا'' گیا کہ یہ تو ایکٹنگ تھی اس کے بعد میں نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔''

مقصود الٰہی شیخ اپنی تہذیب' تمدن اور ثقافت کے نمائندہ ہیں۔ اسی حوالے سے ان کے افسانوں پر ایک گہری مقصدیت کے نقوش موجود ہیں مگر یہ مقصدیت کہیں پر بھی اس سطح پر نہیں ابھرتی، جب یہ فن کی بنیادی اقدار کی نفی کرتی ہے اور آرٹ آرٹ نہیں رہتا، وعظ و نصیحت کی شکل

اختیار کر لیتا ہے، وہ کہیں دو تہذیبوں کے مابین پسے ہوئے فرد کی کشمکش کی تصویر پیش کرتے ہیں اور کہیں وہ مغربی تہذیب کے لگائے ہوئے زخموں کو سہلاتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں اور بے اختیار ہو کر مشرقی اقدار اور ماحول کو یاد کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ''بازدید'' ان کا نمائندہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ پلاٹ کو ایک نئے ڈھنگ اور ہنر سے تعمیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں موجود کردار دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ خود ہی پلاٹ کو مکمل کرتے ہیں۔ یہ کردار کبھی ماضی میں زندگی کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں، کہیں ان پر ماضی کی رومانی یاد سایہ کرتی ہے۔ افسانہ نگار یہاں پر شعور کی رو کی تکنیک جزوی سطح پر برتتے ہوئے شعور کی رو اور رومانوی جمالیات کو یکجا کرتے ہیں۔ اس طرح تعمیر ہونے والا پلاٹ بظاہر مختلف النوع ٹکڑوں سے وحدت حاصل کرتا ہے، چھوٹی چھوٹی قاشوں میں بٹی ہوئی زندگی ایسی سطح پر آ جاتی ہے جہاں بے ربط ٹکڑے ربط باہم حاصل کرتے ہیں۔

''پتوں پر تصویریں'' اسی قسم کی پلاٹ کی مثال ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کے ہاں برصغیر کے طبقاتی نظام کی تباہ کاریوں کا عکس ہے اور چور دروازے سے اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے والوں کی ضمیر فروشی کا زخم بھی ہے۔ یہ ہماری قومی تاریخ کا تاریک باب ہے کہ جب تحریک پاکستان فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تو کنارے پر پہنچے والی کشتی پر وہ سینکڑوں یونی نسٹ قابض ہو گئے جن کا اس تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور جو انگریز کے آلہ کار تھے افسوس ہے کہ ابن الوقتی کا یہ سفر آج تک جاری ہے۔ بے اصول' بے ضمیر اور اپنی رائے سے محروم اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور اصول پرست اور صاحب الرائے خوار ہو رہے ہیں (حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں)۔

مقصود الٰہی شیخ برطانوی معاشرے میں پاکستان کے سفیر کے طور پر ابھرتے ہیں، وہ اس معاشرے میں بھی مشرقی اقدار کی شمع کو روشن کر رہے ہیں، وہ مشرقی معاشرت کی منافقت کو

برطانوی معاشرے کی بے باکی کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو گہری سوچ اور گہرے غبار میں کھو جاتے ہیں، وہ اپنے افسانے ''دو چار قدم'' میں انسانی سرشت اور فطرت میں موجود بعض کمزوریوں اور خامیوں کو بڑے جاندار طریقے سے ابھارتے ہیں، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی کمزوریاں سب میں موجود ہوتی ہیں مگر ہم سب اسے تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس منافقت کی تہہ مشرق معاشروں میں بہت گہری نظر آتی ہے کہ یہاں گفتار اور کردار میں بعدالمشرقین ہوتا ہے۔

زندگی میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں جب انسان اپنے ماضی سے خوف زدہ ہو جاتا ہے، وہ اس سے آنکھ بچا کر فرار ہونا چاہتا ہے مگر اہل جہاں اس کے ماضی کی ایک ایک جھلک اسے دکھاتے ہیں۔ جب کہ ماضی کی ایک سطح ایسی بھی ہے جو انسان کو ہر لحظہ نئے سفر کے لیے تیار رکھتی ہے۔ انسان حال کی تلخیوں سے آنکھ بچا کر خود اس سمندر میں اترتا ہے اور پھر دیر تک اس میں غوطہ زن رہتا ہے، وہ پوری طرح سیراب ہو کر ایک بار پھر شانت ہو جاتا ہے، سمندر کی طغیانی اور اس کے مدوجزر اسے اپنے اندر منتقل ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور پھر یہ باطن کے سمندر میں مل کر ایک نئی لہر کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں، ایک ایسی لہر میں جو زندگی کو نگلنے والی نہیں بلکہ زندگی کو توانائیاں بخشنے والی ہوتی ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں میں یہ احساس بھی بڑا گہرا ہے کہ وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔ یہ متاع آہستہ آہستہ ہماری گرفت سے نکلی جارہی ہے، جیسے کوئی دولت ہے جو خاک میں گر کر خاک ہوئی جارہی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وقت کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ اس سیل بلا کے آگے کوئی بند، کوئی فصیل، کوئی دیوار کام نہیں آسکتی کہ ایسی کوشش کرنے والے وقت کے پیروں تلے روندے جاتے ہیں۔ وقت کا ہاتھ سے پھسلنے کا المیہ ان کے ہاں رومانیت کے گہرے اثرات کو ابھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس بے بسی کے عالم میں وہ قاری کو اپنی آغوش

میں لے کر لوری سنانے لگتے ہیں۔ ایسی لوری جو کسی اچھے خواب کی آمد کے لیے راہ ہموار کرے تا کہ زندگی کسی خواب کے تعاقب میں پھر سے رواں دواں ہو سکے۔ ''طرز تغافل نہ عرض تمنا'' میں فراموش شدہ محبتیں کسی کونے میں چھپے کاغذ کے ٹکڑے کی مدد سے پھر ابھرتی ہیں اور ایک اٹل حقیقت کی طرح سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

''فراموش کردہ چھوٹے سے جیولری بوکس کو بن چاہے بلا ضرورت دفعتاً ہاتھ کیا لگا بیٹھے گی، بکھیڑے میں پڑ جائے گی' تو ہرگز سنگھار میز کو ٹٹولتی نہ پھرولتی! اسے کیا خبر تھی ایک دیرینہ اتحاف' ایک پرانی سوغات کے افعی کو ڈسوا کر نیلی پڑ پڑ جائے گی...... یہ نہ ہو گا یوسف کا محبت نامہ مروڑ کر دور پھینک کر یا ضائع کر کے نچنت ہو جائے! الٹا وہ نامہ محبت دل کے گلاب میں خار بن کر چبھے گا لہو رسے گا!!

''اس نے، ڈاکٹر امروزہ کمال نے دل ہی دل میں گنتی کی' ایک سے دوسرے ہاتھ تک نوبت نہ پہنچی۔ وچھوڑے (جدائی، ہجر) کے بیتے سال گنے گئے وہ جیسے ڈھے گئی! کتنی جلدی سب کچھ بدل گیا۔''

مغربی معاشروں میں جہاں فرد کی آزادی کی مثال دی جاتی ہے وہاں اس آزادی کے باعث بعض طبقات بالکل بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں' ایسے معاشروں میں رشتے اپنی قدر کھو دیتے ہیں اور سب کچھ معاشی ترازو میں تلنے لگتا ہے۔ ہر کام کو مالی منفعت کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں مشترک خاندان کا تصور دم توڑ چکا ہے۔ مغربی معاشرے کی ایک بھیانک روایت وہاں کے اولڈ ہوم ہیں، جہاں بوڑھے لوگ اپنے عزیز و اقارب کے طویل انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ لوگ اولڈ ہوم کیوں پہنچتے ہیں؟ اس کے پس منظر میں کیا محرکات کارفرما ہوتے ہیں؟ اس کی بھرپور عکاسی ''زوال ولا زوال'' میں بیان ہوئی

ہے، جہاں پر باپ کی قربانی رائیگاں چلی جاتی ہے، جہاں مشرقی طرز معاشرت اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے معیارات اور طرزِ تربیت اہمیت کھو بیٹھتے ہیں اور اولاد اپنے والد سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اس المیہ کو افسانہ نگار نے پوری تخلیقی قوت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ اس افسانے میں معدوم ہوتی ہوئی نسل کا المیہ ہے کہ پیڑ جب اپنے بچھڑنے والے پتوں کو ہلاتے ہیں، صدائیں دیتے ہیں مگر وقت کی تند و تیز ہوا ان کو بہت دور اڑا لے جاتی ہے۔ وہاں جہاں پر ان بوڑھے پیڑوں کی کوئی فریاد، کوئی آہ، کوئی پکار، کوئی دل کی دھڑکن کار آمد نہیں ہے۔ سب رائیگاں اور بے سود کاوش ہے۔

زبان تو انسانی مافی الضمیر کی نمائندہ ہے ہی مگر ایک عمر انسان کی زندگی میں ایسی بھی ہوتی ہے جب انسان کے جسم کا انگ انگ باتیں کرتا ہے، گیت گنگناتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور یہ عمر محبت کی عمر ہوتی ہے ایسی محبت جو محبوب کی خاطر دنیا کی تمام چیزوں کو تیاگنے پر قادر ہوتی ہے۔

''دھواں دھواں سی یہ زندگی'' اسی عمر کی کہانی ہے اس میں اسلوبیاتی سطح پر جو سسپنس، تجسس، روانی اور بہاؤ موجود ہے وہ افسانہ نگار کے خاص اسلوب کا نمائندہ ہے۔ اس افسانے میں صدف اور کونین کے کرداروں کی تعمیر افسانہ نگار کے فنی کمال کا آئینہ ہے، گو کہ یہ افسانہ کے ضمنی کردار ہیں اس کے باوجود ان کے خدوخال یوں ابھارے گئے ہیں کہ یہ اپنے ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں افسانے کے واحد متکلم کی باطنی کیفیات اور خود کلامی کی روایتی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ افسانہ اپنے آرٹ اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے متاثر کن ہے۔ باقی افسانوں کے برعکس اس میں علامتی عمل ابھر رہا ہے جس میں ابلاغ اور اظہار کا عمل مختلف سطحوں میں ابھر رہا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانے موضوعات کے حوالے سے سماجی زیادہ ہیں، سیاسی و رومانوی کم کم ہیں لیکن ایک اچھا تخلیق کار اپنے اردگرد کے سیاسی مدوجزر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے باعث اس کے اندر طلاطم برپا ہونا عین فطری عمل ہے، وہ اصولوں کی شکست

وریخت اور انسانیت کی تذلیل پر غیر جانبدار اور خاموش تماشائی نہیں بن سکتا کیونکہ ایسے مرحلہ میں غیر جانبداری کا مطلب معاشرے کی منفی قوتوں کی حمایت ہوتا ہے۔ ''مجبوریاں'' میں افسانہ نگار نے سیاسی حالات کے پیش نظر عام انسانوں کی ذہنی اذیت اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے، جو ہر ظلم اور ناانصافی پر ''قہر درویش بر جان درویش'' کے مصداق محض کشمکش اور ذہنی اذیت میں مبتلا ہو کر اپنا نقصان کر سکتے ہیں، باطل قوتوں سے لڑنے کے لیے طاقت اور حوصلہ ان کے ہاں موجود نہیں ہے۔

انسانوں کی درجہ بندی کا عمل ویسے بھی کوئی ایسا فعل نہیں ہے کہ جسے سراہا جائے۔ اس درجہ بندی کے پس منظر میں اگر رنگ نسل اور پیشہ کو رکھا گیا ہو تو پھر یہ زیادہ سنگین اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی آج جس بحرانی دور سے گزر رہی ہے اس کے پس منظر میں یہ انسانی درجہ بندی موجود ہے۔ ''لکڑی کی تلوار'' میں افسانہ نگار نے ہمارے عام معاشرتی رویوں پر بڑی بلیغ طنز کی ہے، طنز کی یہ کاٹ بڑی نمایاں ہے، افسانے میں آپا کا کردار اپنے اندر بڑی وسعت لیے ہوئے ہے۔ یہ محض ایک بیوہ عورت کا کردار نہیں ہے بلکہ ہماری مجموعی معاشرتی سوچ کا نمائندہ ہے۔

''سچ مچ'' میں نسلی و مذہبی فسادات کا ذکر ہے ان فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلأ کو افسانہ نگار نے بیشتر جزئیات سمیت بیان کر دیا ہے یہاں ہم ان تاریک بستیوں کے اندر جھانکتے ہیں جہاں زندگی کاسہ میں سکہ گرنے کی صدا کے انتظار کا نام ہے۔ ایک سکہ گرتا ہے تو دوسرے سکے کی صدا کے لیے کان منتظر ہوتے ہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک رخ ہے، جیسے زندگی کے ہر کردار کی اپنی کہانی ہے، اپنی تمنائیں اور ارمان ہیں یہ محض چند گداگروں کی کہانی نہیں ہے، اس کے باطن میں طرح طرح کی کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ زندگی ان کو مختلف انداز سے ملی ہے۔

''ان کی جانیں ہی ان کا اثاثہ اور سب سے بڑا ہتھیار تھیں لیکن ان کی صبح بخیر نہ ہوتی تھی سوتے میں تڑپتے اور تڑپ کر جاگتے' کوئی کھانس رہا ہے، خون اور بلغم تھوک رہا ہے، گر گر پڑتا ہے۔ یہ بڑا دل شکن منظر ہوتا، ان کی حالت پر بے پروا اور بے نیاز راہ چلتے ہوئے لوگوں کا سکون

بھی تلپٹ ہو جاتا کہ وہ بے بس اور مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ کسی کسی کو گہری نیند سے اٹھانا ہی ممکن نہ ہوتا، یوں ہمیشہ کے لیے سکھ کی نیند سونے والوں کو میونسپلٹی کے کارکن ٹرکوں میں لکڑیوں کی طرح ڈال کر کہیں دور لے جا کر گاڑ دیتے، وہاں کوئی پرسان حال یا رونے والا نہیں تھا ''بس خس کم جہاں پاک''۔

اس افسانے میں بہت سے موضوعات ضمنی طور پر ابھرتے ہیں یہ ہماری سیاسی تاریخ کا بھی احاطہ کرتا ہے، سیاسی شعور کی کمی کا ذکر بھی ہے کہ ہم کس طرح ہر بار استحصالی قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتے ہیں اور اپنے ہی بھائیوں کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔ حکمرانوں کے روایتی ہتکھنڈے ہیں جن کی بدولت وہ اطمینان سے حکومت کرتے ہیں۔

> ''میں دلیل دیتا عوام کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، وہ یونیورسٹی میں میری یادگار تقریر کا حوالہ دیتی'' استحصالی قوتیں گڑے مردے اکھاڑنے میں ماہر ہوتی ہیں، ممولوں کو شہباز سے لڑواتی اور رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکمرانی کرتی ہیں۔''

''سچ مچ'' اس لیے بھی زیادہ متاثر کن ہے کہ اس میں افسانہ نگار کے ہاں موجود سیاسی و سماجی شعور کی خوبصورت جھلکیاں ملتی ہیں۔ کہانی میں ضمنی سطح پر ابھرنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات ہمیں زندگی کے مختلف گوشوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ یہاں مختلف رنگ ابھرتے ہیں اور یہاں مختلف قسم کی دنیائیں ہماری منتظر ہیں۔

ان افسانوں کے کردار اعلیٰ متوسط طبقہ سے متعلق ہونے کے باوجود کسی فلسفیانہ موشگافی یا پیچیدگی میں مبتلا نظر نہیں آتے وہ بھی زندگی کے کم و بیش انھیں مسائل کا شکار ہیں جن سے ہمارے پسماندہ نیم طبقات گزرتے ہیں۔ ان کے ہاں کرداروں کا عام لوگوں کی سطح پر آ کر غور و فکر ان افسانوں کو زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول بناتا ہے یہیں پر یہ کہانیاں معروضیت حاصل کرتی ہیں

اوران میں موجود کرداروں کے دکھ'ان کی خوشیاں کسی آفاقی موج کا حصہ نظر آنے لگتی ہیں۔

ان افسانوں کے کرداروں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ زندگی کے متعلق بڑی متوازن رائے رکھتے ہیں۔اسی لیے عام طور پران کا ردعمل شدید نہیں ہے بلکہ یہ بڑا نپا تلا ہے' تہذیب شدہ ہے، وہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ بھی نہیں کرتے اور گزارا بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے نچلے متوسط طبقے کا مسئلہ ہے اور یہ اسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار زندگی کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے عملی جدوجہد کا حصہ نہیں بنتے بلکہ ذاتی سطح پر اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانے زندگی کی اس سطح پر ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں جہاں زندگی ٹھوس نہیں غیر مرئی شکل میں ڈھل جاتی ہے اور ہم اسے دیکھنے کی بجائے محسوس کرتے ہیں۔ہم زندگی کی ایسی جہات تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو محسوسات کے دائرے سے باہر ہیں اور ہم پر زندگی کے وہ دروازے وا ہوتے ہیں، جن کے بغیر زندگی کی تکمیلی صورت نہیں ابھر سکتی جو زندگی کا لازمہ ہوتے ہوئے بھی اس سے کٹ کر کہیں گوشہ گمنامی میں پڑے رہتے ہیں۔مقصود الٰہی شیخ کے افسانے ہم پر ان اجنبی دیاروں کے در کھولتے ہیں۔

ارشد نعیم

شیخوپورہ' 27اپریل 2004ء

”چاند چہرے سمندر آنکھیں“

مقصود الٰہی شیخ نے دشت افسانہ کی سیاحت میں عمر گزاری، اہم بات یہ کہ عمر رائیگاں نہ گئی۔ مقصود الٰہی شیخ کا نظریہ ہے کہ افسانہ زندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ ادب ذہنی ہم آہنگی کا مضبوط ترین ذریعہ ہے۔ اُن کے افسانوں کے مطالعے کے بعد اس رائے کی توثیق ہو جاتی ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہجرت ہے۔ مٹی جب پاؤں پکڑنا چھوڑ دے، خانہ بدوشی کے عذاب جسم و جاں پر اترنے لگیں، ہجرت کے دیکھے گئے خوابوں کے سکھ تعبیر میں دکھ عطا کرنے لگیں، مادیت پرستی کی یلغار جب روحانی اقدار کو پامال کرنے لگے، محنتوں کے کوہِ گراں تراش کر اولاد کے لیے محل تعمیر کرنے والے انہی کی محبتوں سے محروم رہ جائیں کہ اب ان کا وجود بے مصرف اور ان چاہا ہے۔ جب انسانی رشتوں کی تہہ داری اور اہمیت سے انکار، تنہائی، حرماں نصیبی، اعصاب زدگی، انتشار، اضطراب اور پریشانی کو جنم دینے لگیں، تہذیب، مذہب، اخلاق روحانی اقدار قصہ پارینہ بننے لگیں، مادی ترقی اور اس کے نتیجے میں انسانیت کی تذلیل و تحقیر روز کا معمول ہو جائے، زندگی، ہنگامہ، شور، افراتفری اور نفسانفسی سے عبارت ہو کر رہ جائے تو مقصود الٰہی شیخ کے افسانے جنم لیتے ہیں۔ ان افسانوں میں دہشت کی فضا بھی ہے۔ رومان انگیز اندھیرے، اجالے کا امتزاج بھی، اقتصادی، سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی الجھنیں بھی ہیں اور بے سمتی و لایعنیت کے دکھ بھی کہ آج بیشتر افراد بے مقصد قیدِ حیات میں مبتلا ہیں۔ مصنف کا عصری شعور اور سماجی احساسِ ذمہ داری ان افسانوں کی تخلیق کا باعث ہوا ہے۔ بیانیہ انداز میں لکھے گئے یہ افسانے سنائے بھی جا سکتے ہیں اور دکھائے بھی۔

مقصود الٰہی شیخ نے زندگی کا ایک طویل عرصہ وطن سے دور دیارِ غیر میں بسر کیا۔ ان کے بیشتر افسانے واحد متکلم میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی ”میں“ ان تمام افراد کی نمائندگی کرتی ہے جو حکم

خدا، رزق کی تلاش، حصول علم کے لیے، خود ساختہ جلا وطنی یا سیاسی وطن بدری کے باعث اپنی مٹی سے ناطہ توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایک مخصوص مدت کیلئے آتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی تمام زندگی یہیں بسر کر جاتے ہیں۔

''میں'' کے پردے میں ہر وہ غریب الوطن مستور ہے۔ نئی تہذیب، معاشرت، ماحول، زبان، ادب آداب، اخلاق، تعلیم و تربیت کے نئے تقاضے، سماجی تفاوت، غرض ہر قدم پر کسی نئے مسئلے کا سامنا کرتا ہے۔ ہر فرد کا تجربہ مختلف ہے، کہانی مختلف ہے، دکھ مختلف ہیں لیکن ان غریب الوطنوں پر گزرنے والی وارداتوں اور کیفیات کا بیان مقصود الٰہی شیخ نے یوں کیا ہے کہ جگ بیتی آپ بیتی کے روپ میں ڈھل کر زیادہ تاثر اور تاثیر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں میں تہذیب' سیاست' معاشرت اور تاریخ پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔ زندگی انہی سے عبارت ہے۔ فلیش بیک کی تکنیک نہایت مہارت اور چابکدستی سے برتتے ہیں۔ ماضی سے حال اور حال سے ماضی کے سفر کا سبب عصر موجود کی نا آسودگیوں اور محرومیوں سے گھبرا کر حال سے فرار' ماضی میں پناہ لینے کی خواہش بھی ہو سکتا ہے اور ماضی' حال کا موازنہ بھی اور نتیجہ وہی آفاقی کہ ماضی ہمیشہ حال سے بہتر ہوتا ہے۔ ناسٹلجیا کی یہ کیفیت تقریباً ہر افسانے میں موجود ہے۔

''بازدید'' دو تہذیبوں کی کہانی ہے۔ مشرق و مغرب کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ خواہ سالوں صدیوں تک ربط ضبط رہے۔ یہاں زیست کرنے کے لیے فرد کو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، مصالحت سے کام لیا جاتا ہے۔ وجہ صرف اتنی کہ احتجاج کی ہمت ہے نہ اجازت۔ دیارِ غیر میں بسنے والے افراد کا سب سے بڑا المیہ اولاد کے مسائل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ مغربی ماحول و معاشرت، تہذیب و تمدن میں پرورش پانے والے بچوں کے لیے باپ کی یہ خواہش وہ اپنے دین، مذہب، زبان و ادب، تہذیب و معاشرت سے نہ صرف آگاہ ہوں بلکہ ان پر عمل پیرا بھی ہوں۔ تہذیبوں کا

تصادم اپنی ہی اولاد کے رویوں میں نظر آنے لگے تو انسان کا غضب ناک ہو جانا فطری ہے لیکن پھر وہی سمجھوتے کی چادر اور دم توڑتی خواہش اور وطن کی یاد! کیا میں وطن جاؤں گا، جا سکوں گا؟

''زوال لازوال'' بھی ہجرت کے نتیجے میں غم و اندوہ اور مسائل کے کھلتے باب کی داستان ہے۔ ترک وطن' تاریخ و تہذیب سے خارجی طور پر رشتہ توڑ لینے کا نام ہے لیکن کیا باطن سے، دل سے، کبھی کوئی اس محبت کو کھرچ سکا ہے جو فرد کو اپنی مٹی سے ہے؟

''زوال لازوال'' تنہائی اس کا مرکزی نقطہ ہے، یہ کہانی بھی ماضی سے حال اور حال سے ماضی کی طرف لپکتی ہے۔ بیوی کی موت کے بعد دو بچوں کی پرورش میں دن رات ایک کر دینا، اپنی ذات کی نفی کر کے انہیں پروان چڑھانا اور بچوں کے ذرا بڑا ہو جانے پر دو تہذیبوں کے ٹکراؤ، روایات و اقدار کی باہمی تفریق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا پنڈورہ بوکس، بدلتے سماجی حوالوں کے المیے، اولاد کا اپنی زندگی اپنی منشا کے مطابق گزارنے کا فیصلہ، باپ کی محبت و محنت کو نظر انداز کر کے اس کی سختی و سرزنش کو بنیاد بنا کر اسے تنہائی کی آگ میں دھکیل دینا، یہ عمر رسیدہ لوگ کہ جنہوں نے نہایت فعال، محنت و مشقت سے بھرپور زندگی گزاری۔ اس کے صلے میں معاشرے میں مقتدر مقام حاصل کیا، جو چاہا وہ پایا اور پھر اپنی محبتیں اپنے پیاروں میں اس حد تک تقسیم کیں کہ جب خود اُنہیں محبتوں کی ضرورت، توجہ کی طلب ہوئی تو کسی کے پاس اُنھیں دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ کچھ تھا تو صرف اولڈ پیپلز ہوم! یہی ان کا ٹھکانہ' یہی ان کی جائے پناہ اور کبھی ختم نہ ہونے والا انتظار ان کا مقدر لیکن اگر یہ اولڈ پیپلز ہوم بھی نہ ہوتے تو موت کا انتظار کس قدر بھیانک صورت اختیار کر سکتا تھا۔

> ''یہ ہوم ان کے لیے تازہ ہوادار کھڑکی ہے جس سے چھن چھن کر امید اور روشنی کی کرنیں ان تک پہنچ رہی ہیں۔ کچھ تو ہوا۔ اس نے سماجی کارکنوں سے وعدہ کیا وہ ان مرجھاتی روحوں میں تازگی و دلچسپی پھونکنے کی کوشش

کرے گا...... کیا خبر اس طرح اس کی اپنی تنہائی کے زخموں کی جراحت کا بھی سامان ہو جائے''۔

عصری تاریخ کا مطالعہ مورخ کے قلم سے لکھے گئے الفاظ کے بجائے تخلیق کار خواہ وہ شعر میں اپنے جذبہ واحساس کا بیان کرے یا نثر کی صورت میں زیادہ پراثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سماجی حقائق سے آگہی کے لیے ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ تاریخ کی کتابوں کے اوراق ہی کھنگالے جائیں۔ اپنے عہد کے دگرگوں سیاسی سماجی معاشی حالات شعروادب میں' زیادہ موثر انداز میں' زیادہ حقیقی صورت میں کہ حکمران کیا چاہتے ہیں' عوام کی خواہش کیا ہے وہ کیا سوچتے ہیں' کیا محسوس کرتے ہیں' مل جائیں گے۔

عراق پر امریکہ کی تباہ کاریوں' لوٹ مار اور ظلم و بربریت اور غرور ونخوت کی انتہا اور دوسری جانب بے بسی و بے چارگی' مفلسی و ناداری' اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرت' بے حسی' غیظ وغضب، بے یقینی، بے ردائی، نارسائی، خوف و ہراس اور اس پس منظر میں تحریر کیا گیا افسانہ ''مجبوریاں''..... ان دو دوستوں کا قصہ ہے جو دیار غیر میں بہتر معیار زندگی کی تلاش میں آتے ہیں۔ وہ گہرے دوست ہیں' بحث کرنا مشغلہ ہے' اختلاف رائے حق ہے۔ ہر مرتبہ لڑ کر روٹھ کر جدا ہوتے ہیں۔ جدائی کے زمانے میں ایک دوسرے کی طرف سے صلح نامے کا انتظار کرتے ہیں اور آخری مرتبہ کی لڑائی کے بعد بھی یہی کیفیت ہے۔ فون خاموش ہے۔ دونوں بار بار فون کی طرف بڑھتے ہیں۔ رک جاتے ہیں اور ٹی وی وہ منظر دکھا رہا ہے!

> ''آتشیں کلسٹر بموں کے ٹکڑے لگنے سے بدن سے رستا لہو نالیوں میں بہہ رہا ہے۔ ہر سُو تباہی اور غارت گری محیط ہے۔ بے گھروں' در بدری کے ماروں پر رحم کھاتے' دور دراز بیٹھے مفلوج' یہ خوف زدہ سے دونوں انسان دوست اپنے اپنے گھروں میں مجبور سہمے اور دبکے بیٹھے ہیں''

اتفاق کہاں ہوتا ہے؟

مظفر ٹی۔وی بند کر دیتا ہے

شاید حسن نے بھی ٹی۔وی بند کر دیا ہوگا

''دھواں دھواں سی یہ زندگی''میں فرد کی ذاتی زندگی اور اس کے باطنی رخ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ذہنی جذباتی سطح پر شکست وریخت سے دوچار 'کونین' ایک ایسا فرد ہے جو اپنی ذات کے آشوب' ماحول کی جبریت اور سخت گیر والد کے عتاب سے نبرد آزما' سالوں بعد بھی اس آسیب سے رہائی نہ پاسکا۔ وہ اس گرداب سے نکل چکا ہے یا نہیں؟ قاری بھی مصنف کے اس تجسس میں برابر شریک ہے۔ کونین کی انوکھی حسی کیفیات اس کے زیر اثر حرکات' اس کے داخلی کرب اور لاشعور میں چھپے خوف کو ظاہر کرتی ہیں۔ ذہنی انتشار' داخلی کشمکش اور ماضی میں بیتے کربناک لمحوں کی بازگشت کے بیان میں مصنف ماضی سے حال' ایک خیال سے دوسرے خیال' ایک واقعے سے دوسرے واقعے' ایک بات سے دوسری بات کی طرف یوں رواں ہے کہ ایک بے ترتیبی انتظار اور بے ربطی کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن یہ ڈرامائی کیفیت ہی افسانے کو پُرتجسس موڑ عطا کرتی ہے۔

''لکڑی کی تلوار''میں مشرق مغرب کی گڈمڈ ہوتی تہذیبی اقدار کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ آپا کا کردار موثر انداز میں تخلیق کیا گیا ہے۔ بیوہ آپا اپنی اکلوتی بیٹی کے رشتے کے لیے بھائی سے مشورہ مانگتی ہیں۔ بھائی اس رشتے پر راضی ہیں کہ شریف' خوشحال خاندان ہے۔ صرف یہ کہ لڑکے کا والد کبھی فارغ اوقات میں اضافی آمدنی کے لئے لوگوں کی حجامتیں کرتا تھا۔ آپا کا چراغ پا ہونا فطری ہے کہ وہ اس تہذیب سے تعلق رکھتی ہیں کہ جہاں سید اور شیخ ہی صاحب عزت وتوقیر ہیں۔ بھائی سے ناراض ہوکر وہ اس سید خاندان سے اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑ دیتی ہیں جو بے شک کالا دھندا کرتے ہیں۔ پولیس جیل سے ناتا رہتا ہے۔ خیر ہے، حسب نسب تو اونچا ہے۔ افسانے میں پیش کیا گیا نجی واقعہ مشرق کی اس سوچ کی جانب عکاسی کرتا ہے کہ جہاں آج بھی مذہب کے اس

اعلان ''تم میں سے کسی کو کسی پر برتری نہیں' سوائے تقویٰ کے'' کو نظر انداز کرتے ہوئے اخلاقی اقدار روایات کی پاسداری اور حسب نسب پر بے جا تفاخر کیا جاتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ روش مسائل کے لامتناہی سلسلے کو جنم دے سکتی ہے۔

''دستِ تہہ سنگ'' اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مشرقی پاکستان پر گزرنے والی قیامت' مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کا سانحہ' ہماری تاریخ کا وہ المناک باب ہے کہ جو دل کا ناسور بن کر تمام زندگی' اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس دلاتا رہے گا۔

''بظاہر میل جول تھا۔ کوئی اونچ نیچ' امتیاز و تعصب نہ تھا لیکن اندرون خانہ کھچاوٹ بلکہ چھوت چھات! ستم یہ کہ اس ملمع سازی کا کسی کو شعور بھی تو نہ تھا۔ یہ ایک رویہ تھا جو چپ چپاتے ہماری رگوں میں سرائیت کر گیا تھا۔ رہن سہن کے تھوڑے فرق کو ہولے ہولے بے خبری میں ایک بڑی دیوار بنا کر بیچ میں حائل کرتا جا رہا تھا''۔

یہی بے خبری ہمیں لے ڈوبی۔ وہ جو مشرقی پاکستان کے باسی تھے' مغربی پاکستان کو بھی اپنا گھر سمجھتے تھے اس بات پر البتہ شاکی رہے کہ گھر کے دونوں حصوں پر یکساں توجہ نہیں دی جا رہی، ایک کو امیر سے امیر تر اور دوسرے کو غریب سے غریب تر کرنے کے سرکاری منصوبے ان کے دلوں میں دراڑیں ڈالتے رہے اور انجام کار ڈھاکہ ڈھے گیا۔ یہاں سے بنگالی رخصت ہوئے۔ تو قیر النساء باجی کا جانا بھی ٹھہر گیا کہ جن کی آواز پر سبھی فدا تھے لیکن انھیں کم تر تصور کرتے ہوئے فاصلے ہمیشہ درمیان رہے۔ مقصود الٰہی شیخ نے ماضی و حال کی تاریخ کی تفصیلات میں سے ایک ایسے سانحے کا انتخاب کیا جو ہر پاکستانی کا ذاتی دکھ ہے۔ یوں عصری تاریخ کے حقیقی و تخلیقی کرداروں سے تخلیق کیا گیا یہ افسانہ ایک تاریخی دستاویز کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کیا سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے' اس نغمے کو سُر دینے والی آواز تاریخ کا حصہ نہیں؟ افسانے کی ابتدا' انجام سے کی گئی

ہے۔ بقیہ تمام وقت قاری اس انجام کی ابتداء کا متلاشی رہتا ہے۔ باجی توقیر النساء کا تعارف ابتدا میں کرداد یا گیا لیکن یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ وہ نسلاً بنگالی تھیں۔ کہانی کی بنت میں آہستہ آہستہ سب کچھ کھلتا چلا گیا۔ ہمارے ایک بڑے کہانی کار کو یہ گلہ ہے کہ اردو کے افسانہ نگار کرداروں کا تعارف تو کراتے ہیں مقامات سے بے نیاز رہتے ہیں۔ جبکہ شہروں کا بھی ایک کردار ہے جیتا جاگتا ' سانس لیتا اسی سے وہاں کے رہنے والوں کے مزاج تشکیل پاتے ہیں' رویے بنتے بگڑتے ہیں، کسی بھی افسانہ نگار کے افسانوں کا مطالعہ کر لیجیے۔ شہر خاموش ہیں وہ کہانی سیالکوٹ کی بھی ہو سکتی ہے کراچی کی بھی پنڈی لاہور کی بھی۔ ان کے افسانوں میں شہر کا دل دھڑکتا کیوں محسوس نہیں ہوتا؟ مقصود الٰہی شیخ کے افسانے ان کی اس شکایت کا ازالہ کرتے ہیں۔ شہر مغرب کے ہوں یا مشرق کے۔ ان کے افسانوں میں اپنی مخصوص حیثیت کے ساتھ' ماحول اور معاشرت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں کراچی انٹلی جنس اسکول کی ہٹوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُس زمانے کا کراچی ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو کر آجاتا ہے جہاں قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں اپنے عہد کے سرکردہ افراد' جنھوں نے شعر و ادب' سیاست و تعلیم' غرض فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں میں بڑا نام پایا، یہیں مقیم تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نامساعد حالات میں' موسم کے سرد و گرم سے بے پروا ہو کر نئے ملک کی تعمیر و تشکیل میں اپنا آپ بھلا کر محنت کی۔

مشرقی پاکستان ہی کے سلسلے کا دوسرا افسانہ ''سچ مچ'' ہے نیک و معصوم فرد جب کسی وحشت ناک' وحشت و بربریت سے پُر صورت حال سے متصادم ہوتا ہے تب انسانیت کا چہرہ کس قدر مسخ ہو جاتا ہے اور اگر اس فرد کا تعلق صنف نازک سے ہو تو اس پر قیامت کس طرح ٹوٹتی ہے؟ اپنے عہد کی زندگی کا ادراک' تنقیدی نقطہ نگاہ سے کرتے ہوئے مصنف نے اس اجتماعی تجربے کو انفرادی المیے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا ہر محبِ وطن فرد اس المیہ سے متاثر ہوا۔ سبھی پر قیامت گزری۔ ہر ایک نے اپنی اپنی قیامت کے عذاب خود ہی جھیلے۔ کسی دوسرے میں

ہمت' حوصلہ اور ظرف ہی کہاں تھا؟ والدین بھی دستبردار ہو جائیں تو نوجوان بیٹی پر وہی کچھ گزرتی ہے جو سیما کا مقدر ٹھہرا۔ سیتا کو چودہ سال کا بن باس ملا تھا۔ سیما تیس سال کا بن باس کاٹ کر بھی نامراد رہی یا بامراد، فیصلہ کون کرے گا؟۔

''چاند چہرے' سمندر آنکھیں'' کا مطالعہ کیجیے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ میری اس رائے سے متفق ہوں کہ ارادے ٹوٹتے ہیں' دل شکستہ ہوتے ہیں۔ ذہن بکھرتے ہیں۔ تہذیب مٹتی ہے۔ تاریخ ان چاہا موڑ لیتی ہے۔ زندگی لخت لخت ہوتی ہے۔ انفرادیت' اجتماعیت کے حلق میں چیخ بن کر اٹکتی ہے۔ ماؤں کے قدموں تلے جنت کا حصول تشکیک کا پیراہن اوڑھ لیتا ہے۔ خانہ بدوش اپنے گھروں کو پلٹ پلٹ کر حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مٹی سے اور ماں سے باغی افراد جب مدد کے معاہدوں سے انحراف کرنے لگتے ہیں، پرندے اپنے گھونسلوں کو خیرباد کہہ کر ہم شجروں کی خبر سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

ماضی کے طاق پر دھرے چہرے ماند پڑ جاتے ہیں۔ یادیں برہنہ سر بھرے بازار میں ہراساں وترساں پھر پھر کر تھک کر چور ہو جاتی ہیں۔ تنہائی اور اکلاپے کے ہمراہ رقص کرتا فرد نڈھال ہو جاتا ہے۔ کمروں کے درمیان جب فاصلے بڑھ جاتے ہیں یاد کی فصیلوں پر گئے دنوں کے لکھے نوحوں کی سیاسی مدہم پڑنے کے دکھ جاگنے لگتے ہیں اور منزل پر پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ سفر تمام نہیں ہوا بلکہ آخری منزل ہی سب سے کٹھن ہے تو مقصود الٰہی شیخ کے افسانے تشکیل پاتے ہیں۔

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

اسلام آباد، 4 اپریل 2004ء

دست تہہ سنگ

باجی توقیر کے فوت ہونے کی خبر ملنے پر ہم سب بہت روئے تھے۔ وہ کوئی معمولی ہستی نہ تھیں۔ لائق فائق تھی ایک معروف گھرانے سے تھیں۔ اس بات پر مزید روئے کہ ان کے انتقال کو تو ایک ماہ ہو چکا ہے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں چلا۔ آخر کیا ہوا؟ بیمار تھیں یا دل بند ہوا؟ یہ ان کے مرنے کے دن نہ تھے۔

ان کا پورا نام توقیر النساء محی الدین قاضی تھا۔ ہم ان کی آواز پر فدا تھے۔ وہ جانی مانی ریڈیو آرٹسٹ تھیں۔ میاں روح الامین طرفدار اعلیٰ سرکاری ملازم تھے۔ ابا کبھی صوبائی وزیر تھے پھر مرکز میں وزیر ہوئے۔ ان سب باتوں کے باوجود ان میں امارت کی خو بو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بڑا سادہ اور نارمل گھرانہ تھا۔ ان کے اور ہمارے خاندانوں میں میل ملاپ بہت بڑھ گیا تھا۔ شروع میں پاس پاس رہتے تھے اور صبح شام بے تکلفانہ ملتے تھے۔

باجی توقیر بڑی لاجواب شخصیت تھیں۔ ہم لوگ ان کا مذاق اڑاتے پر وہ برا نہ مانتیں، مسکرا دیا کرتیں۔ جب اپنے ہاتھ سے کچھ پکاتیں تو ہمارے چکھنے کے لئے پیالہ بھر کر بھیجتیں۔ ان کی پکائی مچھلی کا ذائقہ آج یاد کرتے ہیں۔ تب اماں کی پھٹکار پر کہ پوچھنے پر "جھوٹ بولو گے؟ تھوڑا چکھ تو لو" سب نتھنے سکوڑ کر، تھوڑا تھوڑا چکھتے باقی بچا کسی نوکر کو دے دیا جاتا۔ کبھی تو ناک بھوں چڑھاتے تھے کہ تیل کھاتے ہیں۔ آج ہم بھی گھی ترک کر چکے ہیں۔ کلسٹرول کے ڈر سے! پراٹھے تک تیل میں تلے جاتے ہیں۔ ایک روز ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کی ڈش کی ہمارے یہاں کیا قدر ہوتی ہے۔ اس کے بعد باجی توقیر نے کبھی کچھ نہ بھیجا مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائیں، وہ بڑے ظرف والی خاتون تھیں۔

روز کا آنا جانا تھا ہمارے یہاں ڈرائنگ روم کو بچوں سے "محفوظ" رکھنے کے لئے اکثر

بند رکھا جاتا تھا، مہمانوں کے آنے پر کھلتا، اس پابندی سے بھی تنگ تھے کہ اس طرح جگہ کی تنگی محسوس ہوتی تھی۔ خاص طور پر پڑھائی کے وقت ایک دوسرے کی موجودگی کھلتی تھی۔ خیر ہمارے یہاں سجاوٹ میں مغربی رنگ تھا تو ان کے یہاں سب انداز مشرقی تھے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہر طرف سادگی ہی سادگی نظر آتی۔ کوئی خاص اہتمام نہیں تھا مگر صوفہ یوں آڑے رخ سے رکھا جاتا کہ سارا کمرہ آراستہ لگتا۔ کمرے میں زیادہ سے زیادہ دو پینٹنگز آویزاں ہوں گی مگر پھول ہر سمت میں سجے ہوتے، خاص زاویئے سے ایسے مقام پر کہ ہر آنے والا ان پر تبصرہ کیے بغیر نہ رہتا۔ مہمان خوشامد کے بجائے خود مجبور ہو کر سجاوٹ کی تعریف کرتے! باجی توقیر مسکرا مسکرا کر میٹھے لہجے میں کہا کرتیں ''ارے کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں'' یہ سمجھ میں نہ آنے والا راز تھا۔ ان کی سادگی بھی بڑی شاندار لگتی۔ کوئی جادو تھا کہ سر پر چڑھ کر بولتا اور آنکھوں میں کھبتا تھا۔

کراچی میں ہم انٹیلی جنس اسکول کی ہٹوں میں رہتے تھے۔ ہماری طرح ان کو بھی دو ہٹ ملے ہوئے تھے ایک ہٹ جس میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ اس کے اردگرد انہوں نے ٹماٹر لگا رکھے تھے۔ غسل خانے سے استعمال شدہ پانی کیاری کو سیراب کرتا تھا اور جب ان کے یہاں سے ''پہلی فصل'' پر ٹماٹروں کا تحفہ آتا تو اماں تک استعمال میں لانے سے پرہیز کرتیں! بظاہر میل جول تھا، کوئی اونچ نیچ، امتیاز و تعصب نہ تھا لیکن اندر خانہ کھنچاوٹ بلکہ چھوت چھات! ستم یہ کہ اس ملمع سازی کا کسی کو شعور بھی تو نہ تھا۔ یہ ایک رویہ تھا جو چپ چپاتے ہماری رگوں میں سرائیت کر گیا تھا۔ رہن سہن کے تھوڑے فرق کو ہولے ہولے بے خبری میں ایک بڑی دیوار بنا کر بیچ میں حائل کرتا جا رہا تھا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ زیادہ کھلے، معصوم، بے تکلف اور آزادہ رو لوگ تھے۔ ابا مرکزی وزیر رہ چکے تھے۔ لیکن گھر میں کوئی مرعوب نہ تھا۔ ہمارے یہاں پھوں پھاں بہت تھی، چھری کانٹے کا عام استعمال تھا اور ادھر دعوت میں بھی ہاتھ سے کھاتے تھے۔ ہمارا کوئی آدمی سختی سے مذہب کا پابند نہ تھا۔ نمازیں تک گنڈے دار پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے یہاں ابا ادھر

نماز پڑھ رہے ہیں تو بچیاں دوسری طرف رقص کر رہی ہیں، ہارمونیم بجا رہی ہیں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ بڑا گندھا ہوا ماحول تھا۔ ہم یہ سب دیکھ کر حیران ہوتے۔ عذاب ثواب اور شرع کے حوالے سے بے توقیری و بے حرمتی زیر بحث آتی۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں ایک دوسرے سے مختلف بناتی تھیں۔ باتیں جن کی کوئی خاص اہمیت حیثیت نہیں تھی پھر بھی اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی ''دیکھو تو! عجیب سلسلہ ہے نا؟ بھئی یہ سب کیا ہے؟ معاملات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اب ٹوک بھی تو نہیں سکتے'' وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہوا چل رہی تھی اور یہ احساس تھا کہ ہم' ہم ہیں اور وہ کوئی دوسرے! پھر بھی ہمارے تحفظات' بر بنائے ہمسائیگی اور قریبی تعلقات' ان کے سامنے گر گر پڑتے۔ خدا گواہ ہے ہم سے بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی مگر وہ بے جھجک ملا کرتے تھے۔ شاید یہی خلوص کی اصل بنیاد تھی۔

پھر بڑے زور کی آندھی آئی' طوفان اٹھا' تباہی مچی' بربادی عام ہوئی۔ ڈھا کہ ڈھے گیا۔ وہ وہ ہوا جو کسی عام آدمی کے خواب وخیال میں نہ تھا۔ ایک بازو ٹوٹ گیا۔ وہ ہم سے الگ ہو گئے، جدا ہو گئے۔ اس پر ان کے گھر کا کوئی فرد خوش نہ تھا۔ باجی توقیر نے جاتے جاتے صرف اتنا کہا تھا کہ اب نہ گئے تو بعد میں بڑی مشکل ہوگی ہمیں قبول نہ کیا جائے گا۔ باقاعدہ رونا دھونا ہوا، آتے رہنے کی باتیں ہوئیں مگر کہاں؟ ایک بار دراڑ پڑ گئی سو پڑ گئی۔ کئی سال آپس میں کوئی رابطہ ہی نہ ہو سکا۔

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

موسم بہار کا عام سا مگر خوش گوار دن تھا۔ یہ خبر تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند شاد کر گئی کہ باجی توقیر آئی ہوئی ہیں، سرکاری دعوت پر اپنے میاں کے ساتھ۔ کوئی کانفرنس تھی۔ باجی توقیر معروف فائیو اسٹار ہوٹل میں اتری ہیں۔ ہمارے گھر والوں کے تعلقات حکومت سے زیادہ اچھے نہ

تھے۔ بہت سوچ سوچ کر ایک خفیہ پیغام کے ذریعہ پوچھا گیا "کیا ہم آ کر مل سکتے ہیں؟" جواب میں ٹیکسی میں بیٹھ کر خود باجی آ گئیں۔ ہم لوگ "ڈوز اور ڈونٹس" میں پڑے، بڑے ڈرے اور سہمے ہوئے سے تھے، اپنے گھر میں، اپنے دیس میں، اپنی ہی سرکار سے!! وہ ہمیشہ کی طرح چونکی' چوکس اور سیاسی شعور سے مالا مال تھیں۔ انہوں نے ہمارے دبے دبے خدشے پا اور پڑھ لئے۔ متانت سے بولیں "ارے سب چلتا ہے تم چور نہیں ہو' اپوزیشن میں ہو تو کیا؟ تم لوگ کا سگا ماموں حکومت میں ہے، وقت پڑے پر سب ٹھیک کرا لے گا۔" ان کو تازہ صورت حال بتانا غیر مناسب تھا کہ ممانی نے اپنی بھانجی کے لئے اماں کے بھانجے کا رشتہ رد کر دیا ہے اور اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے۔ باجی کے آنے کے بعد ذرا دیر میں تمام خدشے اور احتیاطیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں! یادوں کا ایک لامنتہائی دفتر کھل گیا۔

واپسی پر' ائیر پورٹ پر اترتے ہی' جب توقیر باجی کو بغیر فرد جرم لگائے گرفتار کر لیا گیا تو ہمیں سخت حیرانی ہوئی۔ واقعی بہت صدمہ ہوا تھا۔ بڑا غصہ آیا تھا۔ ہمارا شک ماموں پر تھا۔ ممانی اپنے میاں سے زیادہ انفرمیشن سیکرٹری بنی رہتی تھیں۔ دراصل باجی توقیر مل کر گئیں تو وعدہ کر گئی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کو لے کر ضرور آئیں گی اور ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا جائے گا۔ اس شب' اچانک ممانی صاحبہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ آ پہنچیں۔ "ڈرائیور خالی بیٹھا تھا، ہم نے کہا چلو تم سب سے مل آئیں"۔ ہم سب خوش خوش بیٹھے تھے کسی کا دھیان باجی کے "غیر" ہونے پر نہ گیا۔ کھانے کے بعد باجی سے کچھ "سنانے" کی فرمائش ہوئی تو ممانی پیش پیش تھیں۔ باجی توقیر نے تکلف نہیں، سادگی سے بتایا کہ اب وہ نہیں گاتیں، ریڈیو پر جانا چھوٹ چکا ہے۔ خیر' اصرار ہوا تو انہوں نے ہارمونیم منگوایا۔ ابا کا شوق وفور کر آیا، وہ طبلے کی جوڑی اٹھا لائے۔ "ساز" مدت سے خاموش کونے میں پڑے تھے۔ ہارمونیم کے سُر درست کرنے میں تھوڑا وقت لگا مگر سب شوق سے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ سانولی' سلونی رنگت والی دھان پان باجی توقیر قیمتی سبز ساڑھی میں پختہ عمر

ہوتے ہوئے اچھی لگ رہی تھیں، سب کو مسحور کر رہی تھیں۔ ان کی کشش نے سب کو مغلوب کر رکھا تھا۔ یہ رنگ اس لئے بھی جما کہ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن تھیں۔ چہرے پر سنجیدگی چھا رہی تھی پھر جب باجہ ٹھیک ہو گیا تو انہوں نے دھیمے سے کھنکار کر ہم سب کی طرف دیکھا، اپنے میاں کی طرف دیکھا، ابا کو اشارہ دیا اور طرز گنگنائی۔ ہم سب اس دھن سے آشنا تھے۔ دل جیسے ان کی مٹھی اور ہمارے گلوں میں آ گئے۔ باجی توقیر گا رہی تھیں ''سوہنی دھرتی 'اللہ رکھے قدم قدم آباد'' سبھی جذباتی ہو گئے، وہاں کون نہیں رو رہا تھا، ابا تو اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، اماں سے اٹھا نہ گیا، وہیں بیٹھے بیٹھے اتنا روئیں کہ ہچکی بندھ گئی۔ توقیر باجی خاموش ہوئیں تو بڑی دیر تک کسی کے منہ سے ایک بات تک نہ نکلی۔ گانے کی مزید فرمائش نہ ہوئی۔ چائے کا دور چلا پھر مہمان اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔ رات بھیگ چکی تھی، رات رو رہی تھی، دروازوں پر ہوا سر پٹک رہی ہو گی، چپ کی چادر زمیں تا فلک تن رہی تھی۔

باجی توقیر کی خیریت سے گھر پہنچنے کی اطلاع کے بدلے یہ خبر آئی کہ ان کو ایئر پورٹ پر اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہمیں لگا کہ ہمارے گھر پر بھی خفیہ پہرہ لگا ہوا ہے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہ تھی لیکن باجی کے بارے میں تشویش ہو گئی کہ کیا ماجرا ہوا؟ ابھی خبر کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ دوسری خبر یہ بھی آ گئی کہ عوامی حکومت نے دوسرے ہی روز انہیں بغیر حیل حجت رہا کر دیا ہے۔ کوئی فوجی قانون نہ تھا کہ لمبی مدت کے لئے 'بغیر مقدمہ چلائے' حراست میں رکھا جاتا! سب نے اطمینان کا سانس لیا اور مناسب یہی سمجھا گیا کہ ان سے کوئی رابطہ نہ کیا جائے ویسے ہم بہت سٹپٹائے تھے، مجبوری سی مجبوری تھی! اس بات کا ہمارے یہاں ایک ایک کو بہت غصہ تھا۔ یوں نئے سرے سے ہمارے اور ماموں کے گھرانے میں باقاعدہ خاموش اور سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ہمیں ممانی پر پختہ شبہ تھا کیونکہ محترمہ اپنے شوہر کے محکمہ کے ماتحت افسروں سے ملکی اور عالمی سیاسی صورت حال پر غیر رسمی تبادلہ خیال کی عادی مریضہ تھیں۔ ان کی کسی ایسی ہی حرکت کے نتیجہ میں

باجی توقیر کی ہمارے یہاں آمد و رفت کی بھنک مخالفوں کے کان میں پڑی ہوگی اور بات کا بتنگڑ بن گیا۔ بے چاری باجی توقیر پر الزام لگا، پکڑی گئیں۔ حراست میں رکھا گیا، ہم شرمندہ تھے، ملول تھے، اداس تھے، ناراض اور غصہ میں تھے۔

اس کے بعد باجی توقیر کبھی ادھر نہ آئیں۔ اب ان کے گزر جانے کی خبر آئی۔ ہم زار و قطار روئے۔ ان کی سادگی' بے تکلفی اور خلوص یاد کیا، ان کی خوبیاں جن کو ہم خاطر میں نہ لاتے، اب اعلیٰ صفات میں شمار ہو رہی تھیں۔ وہ نڈر تھیں، بہادر تھیں، مہربان تھیں، نیک اور نرم دل تھیں۔ ان کی گرفتاری کو اپنا قصور جان کر نادم ہوا جا رہا تھا، ہر کوئی قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ ان جیسے لوگ اب کہاں! ابا بار بار گلوگیر ہو کر کہتے ''اگلے وقتوں'' کے سب لوگ اٹھتے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں ابا اگلے وقتوں سے کیا مراد لے رہے تھے؟ دراصل تمام تر تلخیوں کے باوجود دونوں ملکوں میں باہمی خیر سگالی موجود تھی۔ دوسرے پڑوسیوں کا سا معاملہ نہ تھا کہ ضد' ناراضگی اور جھگڑے ختم ہی نہیں ہوتے، ہر وقت جنگ کا دھڑکا لگا ہے۔

اماں نے باجی توقیر کے قل کرائے ختم کا کھانا دیا۔ ایصال ثواب کیلئے' مرحومہ کی پسند کے' کئی بنگالی پکوان پکائے تھے۔ اچانک ماموں آ گئے ان کو بلایا گیا تھا نہ اطلاع دی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ماموں بیٹھے تو جانے کا نام نہ لیا۔ سب مہمان چلے گئے تو انہوں نے فرمائش کر کے چائے منگوائی اور بولے ''میں جانتا ہوں آپ' اتنے دنوں سے بدگمان ہیں۔ اسی لئے ہم سے دور دور ہیں بات بہت پرانی ہو چکی ہے مگر صاف ہو جانی چاہیے۔ آپ اپنے اس خیال کو صحیح مان لیجیے تب بھی ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایک طرح سے مرحومہ کی گرفتاری میں ہمارا بھی ہاتھ تھا''۔ ماموں قبول رہے تھے کہ باجی توقیر کو گرفتار کرانے میں ان کا ہاتھ تھا، اعتراف کر رہے تھے کہ وہ دل شکنی اور ناراضگی کے اسباب سے غافل نہیں ہیں۔ ماموں کی بات سن کر لوگ سناٹے میں آ گئے، کوئی نہ بولا سب چپ رہے۔ دم لے کر ماموں نے ہی بات کا سرا جوڑا ''دراصل ''سقوط

ڈھاکہ'' کے بعد سے باجی توقیر کی آمد تک عام لوگوں کے ہی نہیں دونوں حکومتوں کے تعلقات بڑے حساس دور سے گزر رہے تھے۔ آپ کے گھر ان کی آمد یا باجی توقیر کے ہمارا قومی ترانہ گانے سے ان کی گرفتاری کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اطمینان کر لیجئے کہ یہ میں سچ بتا رہا ہوں، ان باتوں کا ان کی گرفتاری سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔'' اب ماموں نے نئی کروٹ بدلی '' آپ یقین کیجئے گا؟ گرفتاری ان کے مفاد میں کرائی گئی تھی! ماموں جو زبان استعمال کر رہے تھے وہ بڑی معنی خیز تھی۔

''میں آپ کو بتاتا چلوں، ان کے کسی دشمن نے جھوٹی شکایت کی تھی کہ میاں بیوی کانفرنس کے اختتام پر ''ڈی فیکٹ'' کرنے والے ہیں۔ اتفاق سے وہاں میں واحد شخص تھا جو ادھر ان کو ذاتی طور پر بڑی اچھی طرح جانتا تھا اور وفد کے سربراہ وزیر صاحب بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اس سے بڑا اتفاق یہ نکلا کہ ایک زمانے میں جب وہ یہاں تھے ان کی ہماری اچھی خاصی دوستی تھی مختصراً طے پایا کہ واپسی پر صرف بیگم توقیر النساء محی الدین قاضی کو گرفتار کر کے دو ایک روز بعد چھوڑ دیا جائے گا، ایسا ہی ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ڈھونگ کیوں رچایا گیا؟ ان کے شوہر پر کیوں ہاتھ نہ ڈالا گیا؟''

دیر ہو چکی تھی۔ ماموں نے اٹھتے ہوئے منہ میں پان ڈالا اور سب کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''افواہ اور جھوٹی شکایت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اگر اسے فوراً ہی دبا دینے کا عمل اور جتن نہ کیا جائے تو معمولی سی افواہ بھی آگ بھڑکا سکتی ہے''۔

رات بھیگ چکی تھی یہ نہیں معلوم رو بھی رہی تھی یا نہیں؟

بازدید

ہمایوں میرے بچپن کا دوست' میرا کزن سات دن کے لئے لندن آرہا ہے! میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہماری ملاقات ہوئے ایک لمبی مدت ہو چکی تھی۔ اس کی آمد کی خبر نے میرا ناطہ پھر سے وطن اور اہل وطن سے جوڑ دیا۔

جب میں انگلستان آیا تو ہمایوں جاپان میں تھا۔ اس لئے وہ میرے حالات سے زیادہ کیا بالکل واقف نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ میرے آنے کے بعد وہ اپنی تعلیم اور ٹریننگ ختم کر کے، جاپان سے واپس پہنچا تو اسے فوراً بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس کی شادی بھی بڑے اچھے خاندان میں ہوئی۔ بھابھی غیر برادری کی ہیں۔ ان کا نام زبیدہ ہے۔ ان کی ایک بیٹی ہے۔ رخشندہ اور بیٹا تاشفین ہے۔ دونوں یونیورسٹی کے ابتدائی درجوں میں ہیں۔ تاشفین پولو کا شوقین بلکہ اچھا کھلاڑی مشہور ہے۔ انہوں نے ایک طوطا پال رکھا ہے۔ اس کا نام لاڈو ہے۔ دراصل وہ طوطا نہیں طوطی ہے۔ دو بلیاں ہیں۔ سیامی بلی کا نام شونن ہے اور ایرانی بلی نازاں ہے۔ دو کاریں اور ایک پجیرو ہے۔ بڑا سا جدید طرز کا گھر ہے۔

پاکستان میں وہی نہیں میرے بارے میں بہت کم رشتہ داروں کو کچھ معلوم ہے۔ جب یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں میرے پاس آرہا ہے تو خود مجھے تعجب ہوا تھا کہ اسے میرا پتہ کہاں سے ملا؟ اس کے پاپا یعنی میرے ماموں کو ادارے کا نام معلوم تھا، جہاں مجھے آرٹیکل شپ ملی تھی۔ یہ بڑی پرانی بات ہے۔ ہمایوں کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے ادارے کو ایک خط لکھا' ممکن ہو تو مجھ سے رابطہ کرایا جائے۔ ہوا یہ کہ جس فرم میں مجھے آرٹیکل شپ ملی تھی' میں اب وہاں ڈائرکٹر ہوں۔ خط سیدھا مجھی کو ملا۔

اس سے پہلے میں ہمایوں کی آمد کا حال بتاؤں' مناسب ہے کہ اپنا تعارف بھی

کرادوں۔ میں لندن پہنچا تو خوش قسمتی سے ایک بہت ہی اچھے علاقے اور ایک نہایت عمدہ گھر میں

پے انگ گیسٹ (Paying Guest) بننا نصیب ہوا۔ یہ نصیب ہی کی بات ہے ورنہ اس زمانے

میں اس علاقے سے کسی ''کالے'' کا گزر جانا خبر بن جاتا تھا۔ ایک ایک گھر کی مالکن اپنے فرنٹ

گارڈن میں آکر ہمسائی کو بتاتی کہ تم نے دیکھا؟ تم نے سنا؟ ابھی ابھی ادھر سے ایک ''کالا'' گزرا

ہے۔ اس ''خبر'' کا تاثر کچھ ایسا ہی ہوتا تھا کہ جیسے ''رشینز آر کمنگ'' (Russians are

coming) سے ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی رو محسوس ہوتی تھی۔ میری لینڈ لیڈی اچھا تن و توش رکھتی

تھی۔ اس جسامت کے لوگ اپنی خوش مزاجی سے تنگ سے تنگ جگہ میں اپنے بیٹھنے کی گنجائش نکال

لیتے ہیں۔ لینڈ لیڈی مسز مارشل کی نواسی باربرا اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ جب بھی یہ ''خبر'' سن کر

آئی کہ اس علاقے سے کوئی ''کالا'' گزرا ہے، اسے مایوس ہوئی مگر اب تو اس کی نانی کے گھر میں

رہنے کے لیے ایک ''کالا'' آ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خاصی خوش ہوئی کہ میں کوئی بھیانک ''سیاہ''

حادثہ نہیں۔ مجھے بھی وہ خوبصورت لگی۔ یہاں یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ بچپن میں مجھے گڑیائیں جمع

کرنے کا شوق تھا۔ ماما کو میری اس عادت سے چڑ تھی کہ یہ کیا لڑکیوں والا شوق ہے مگر میرے

ڈیڈی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ ماما کو یقین دلاتے کہ ان کے بیٹے میں حسن پرستی کا مادہ ہے اور دیکھ

لینا یہ اپنے لئے حسین ترین دلہن چنے گا! یہ حقیقت ہے کہ خوش ادا باربرا میری پسند پر پوری اتری اور

دوست بن گئی۔ سفید شفاف رنگت، نیلی جھیل آنکھیں اور تعصب سے پاک بھورے بالوں والی

باربرا نئی نئی باتیں جاننے اور دوسروں کے کلچر اور عادات کو سمجھنے کی شوقین تھی۔ ہماری اتنی گہری

دوستی ہوئی کہ مجھے آئے تین چار ماہ ہی ہوئے تھے اور اس کے ساتھ تعارف کو ڈیڑھ دو ماہ کہ ہم وٹ

سن کی تعطیلات میں سیر تفریح کے لئے بے دھڑک اکٹھے آئل آف وائٹ چلے گئے۔ واپسی پر ہم

ایک جان دو قالب ہو چکے تھے۔ ایک روز باربرا نے تجویز کیا کہ میں اس کے ڈیڈ سے مل لوں۔

باربرا کی ممی نہیں تھی۔ اس کے ڈیڈی یارکشائر کے کسی شہر میں چیف کانسٹبل ہوا کرتے تھے۔ اب

ریٹائرڈ ہیں۔ لندن کے پوش اور مہنگے ترین علاقے نائٹس برج میں ان کا ذاتی فلیٹ ہے۔ میرے انکار پر اس نے بتایا کہ ملنا ضروری ہے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مفر نہیں۔

مہربان و شفیق خو مسٹر ڈیوڈ لائٹ فٹ کو میں پسند آ گیا۔ مجبوری تھی یا واقعی وہ بے تعصب تھے۔ اس طرح لندن آنے کے تھوڑے عرصے بعد میں اپنی آرٹیکل شپ کے ابتدائی دنوں میں ہی پابند شریعت ہو گیا یعنی ہماری شادی پہلے چرچ میں عیسائی مذہب کے مطابق ہوئی۔ چرچ میں شادی کے لئے مذہب تبدیل نہیں کرنا پڑتا۔ پادری صاحب باآواز بلند پوچھتے ہیں کہ کسی کو اس شادی پر اعتراض تو نہیں؟ پھر وہ لڑکے اور لڑکی سے تاحیات دکھ سکھ میں ساتھ رہنے کا وعدہ لیتے ہیں۔ اور فوراً مطمئن ہو کر فریقین کے میاں بیوی ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس میں مجھے کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی۔ مسجد میں مولوی صاحب پہلے کلمے پڑھواتے ہیں، باری باری ایجاب وقبول ہوتا ہے پھر نکاح پڑھا جاتا ہے۔ ہمارا نکاح ریجنٹ اسٹریٹ کی مسجد میں ہوا۔ نکاح سے پہلے مسٹر لائٹ فٹ کو تھوڑی تشویش تھی۔ ان کو تسلی دینی پڑی تھی کہ انہیں آخری عمر میں مسلمان نہیں کیا جائے گا۔ میرا نکاح ان کے ساتھ نہیں ان کی صاحبزادی سے ہو رہا ہے!

ہماری یعنی میری اور باربرا کی بیٹی کا نام فیونا ہے۔ اب وہ انیس سال کی ہو چکی ہے۔ فیونا فلموں میں اداکاری کرتی ہے۔

ہمایوں ہفتے کی سہ پہر کو پہنچا تھا۔ ایئرپورٹ سے گھر اور گھر میں دوسری صبح ہونے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ وہ حیران تھا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے جبکہ میرے بارے میں اس کی معلومات صفر ہیں۔ سادہ سی حقیقت یہ تھی کہ میں گھر والوں سے کترا کر کٹ گیا تھا لیکن میرا جو دوست پاکستان سے آتا تھا وہ میرے یہاں آ کر رہتا یا مجھ سے مل کر جاتا تھا۔ یوں میں وہاں کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ میں جس حد تک ممکن تھا ہمایوں سے چھپاتا رہا مگر سونے سے پہلے بتانا ہی پڑا کہ باربرا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ اسے چھاتی کا کینسر ہو گیا تھا۔ علاج سے شفا ہو گئی مگر دو

سال کے بعد پھر حملہ ہوا اور اس موذی مرض نے اسے زیر کرلیا۔ وہ جاں بحق ہوگئی۔ ہمایوں یہ سن کر بہت ملول ہوا۔ ہم پاکستانیوں میں قدرت کی طرف سے ایک خاص وصف عطا ہے کہ ہم رشتہ کی چھاپ سے ہی اس سے متعلق محبتوں اور ذمہ داریوں ہی نہیں توقعات اور شکایتوں کے جذبات سے خود بخود لبریز ہوجاتے ہیں۔ یہ جاننا کہ ''کوئی'' باربرا میری بیوی تھی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس کی بھابھی ہوئی۔ ہمایوں کے دل میں باربرا کی محبت کا پیدا ہوجانا لازمی تھا۔ پھر جب اسے پتہ لگا کہ وہ اس جہاں فانی سے عالم بالا میں جا چکی ہے۔ تو اس کا ملول ہوجانا' پوری طرح میری سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ اتنا اداس ہوگیا کہ مجھ میں ایک گونا احساس جرم (Guilt) چھا گیا کہ وہ نہ مرتی تو اچھا تھا یا میں اسے کم از کم ہمایوں سے ملاقات تک روکے رکھتا!!

صبح اٹھ کر اس نے ضد پکڑلی کہ وہ باربرا کی قبر پر جائے گا۔ قبرستان لندن سے دور سرے (Surrey) میں تھا۔ وہ تمام راستہ چپ چپ رہا۔ پھول چڑھا کر اور دعا کے بعد بھی اس کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ اس کے انتظار' استقبال اور آج کی ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں چپ رہا اور دخل اندازی مناسب نہ سمجھی کہ صدمہ سے نکلے تو پھر اسکے پروگرام کے بارے میں پوچھ تاچھ کروں گا۔ ابھی اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ وہ جس جاپانی فرم کی پاکستانی شاخ میں کام کرتا ہے اس کا لندن دفتر یہاں کے کسی بڑے ادارے کو ''ٹیک اوور'' کررہا ہے۔ اس کے نتیجے میں آئندہ تبدیلیوں کا اثر پاکستانی دفتر پر بھی پڑے گا اسے لئے دونوں اداروں کے ادغام وسمبندھ (merger) سے پہلے جو لوگ لندن بلائے گئے ہیں، ان میں ہمایوں بھی شامل ہے۔

میں لنچ کی تیاری میں لگ گیا۔ ابھی کھانا چن رہا تھا کہ دیکھا ہمایوں اپنا سامان باندھے چلا آرہا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ ٹیکسی بلادو۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ تم میرے کزن کیا دوست بھی نہیں ہو۔ جس نے کبھی اپنی خوشی میں شریک کیا نہ غم میں اور اس قدر غافل رکھا کہ شریک حیات کے گزرنے تک کی خبر نہ دی' ایسا آدمی میرے خلوص ومحبت کا اہل نہیں ہوسکتا مجھے اس سے

کچھ نہیں لینا دینا۔

بڑی مشکل سے اسے منایا۔ ہمایوں کو زندگی کے ابتدائی دور میں ایک دھچکا لگا تھا جس کے بعد اب وہ رواں دھارے میں کسی اکاؤ کے بغیر سفر حیات طے کر رہا تھا اسے لئے اسے میری زندگی کے نشیب وفراز یا ان کے کارن جذبات واحساسات میں کڑا پن آجانے کا ادراک کیوں کر ہوسکتا تھا؟

مجھے ہمایوں سے کوئی گلہ نہ تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری زندگی میں اتار چڑھاؤ آنے سے پہلے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس پر جو بیتی میں جانتا تھا۔ ان دنوں میرے ماموں مرکزی جیل خانے کے جیلر تھے۔ اپنی دیانت داری اور اصول پرستی کی بناء پر مشہور تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ انہوں نے جاپان میں شادی کی تھی' اپنے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے چنانچہ جب ان پر بپتا پڑی تو انہیں خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ جیل میں ایک دہرے قتل میں سزا یافتہ مجرم مرکزی حکومت میں ایک وزیر کا قریبی رشتہ دار اور ایک صوبے کے گورنر کا بھتیجا تھا۔ اس نے اپنی اطالوی بیوی اور ایک بہت بڑے سرکاری افسر کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر ''تھاں'' مار دیا تھا یعنی موقع پر ہی بھون ڈالا تھا۔ خود تھانے حاضر ہوا۔ مقدمہ چلا۔ سزا ملی۔ یہ سب پلان کے مطابق ہوا۔ اب جیل سے فرار کا پروگرام تھا جس کے بعد وہ آزاد ہو کر دندناتا پھرتا اور کوئی اسے نہ پوچھتا۔ اس نے جیل کے اکثر حکام کو خرید لیا تھا۔ ماموں کو کسی طرح سازش کی بھنک پڑ گئی۔ انہوں نے قاتل کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ اس ستم ظریفی کا ذکر پہلے ہی کر دوں کہ مجرم بعد میں اپیل پر بری ہو گیا کہ اس نے عمداً قتل نہیں کیا' اشتعال میں قتل ہو گیا بلکہ پستول مقتول سے چھین کر اپنے دفاع میں چلایا گیا تھا۔ عورت کو اتفاقی گولی لگی تھی۔ یہ سوچا سمجھا اور قتل عمد نہیں تھا وغیرہ وغیرہ ایسا ہی کچھ تھا تاہم فرار کا منصوبہ ناکام ہونے پر ماموں سے بھیانک انتقام لیا گیا۔ قاتل نے ہمایوں کو اغوا کرا لیا۔ وہ قیامت میں نے بھی دیکھی تھی۔ اس کی ماما پاپا پر جو بیت گئی، بیت گئی۔ ہمارے گھر اور مجھ پر کیا بیتی وہ بھی کچھ کم

نہ تھا۔ میں آج تک نہیں بھولا۔

جب ہمایوں بازیاب ہوا تو اسے فوراً ہی مزید تعلیم کے لئے جاپان بھیج دیا گیا۔ میں ادھر آ گیا۔ اس طرح ہم نے اپنے کیریئر مختلف جگہوں اور وقتوں میں شروع کئے اور اب اتنے برسوں بعد ملے تو ہماری محبتوں میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔

یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا کہ ہمایوں کو کس طرح راضی کیا۔ اس میں اتنا وقت صرف ہو گیا کہ باہر نکلنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ اتوار کا باقی بچ رہا سارا وقت گھر پر ایک دوسرے کے ساتھ جانکاری میں گزارا یا البم دیکھے گئے۔ دراصل میں تو اس کے بارے میں سب کچھ ہی جانتا تھا۔ اب اس کے اصرار پر مختصراً آپ بیتی بیان کی۔ مجھے باربرا کیا ملی، لگا میں ہیتھرو ائر پورٹ پر منہ میں چاندی کا نہیں سونے کا چمچہ لے کر اترا تھا۔ باربرا جیسی سوہنی، موہنی بیوی ملی۔ ڈیوڈ جیسا خوش خلق اور مہربان سسر ملا۔ افسوس دونوں باپ بیٹی نہ رہے۔ یہ فلیٹ جس میں رہتا ہوں، لاکھوں پونڈ کا ہے۔ ڈیوڈ نے بیٹی کو دیا اور باربرا میرے نام کر گئی۔

ہمایوں فیونا سے ملنے کا بھی بہت مشتاق تھا۔ مگر وہ اٹلی میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فلمبندی میں مصروف تھی۔

میں نے ہمایوں کو تمام حالات بتا دیئے۔ جن حالات میں شادی ہوئی میں گھر بھی اطلاع نہ دے سکا بلکہ دانستہ ایسا کیا کیونکہ میری منگنی اپنی خالہ زاد سکینہ سے اس وقت ہوئی تھی جب میں چار سال کا تھا اور وہ چار ماہ کی۔ والد نے کھوج لگایا تو ان پر حقیقت روشن ہو گئی۔ انہوں نے پہلے زور دیا کہ میں جیسے تیسے وطن واپس آ جاؤں۔ میں نہ مانا۔ دوسرے دور میں ماں کی شدید بیماری کی اطلاعات آنے لگیں۔ میں سمجھا مجھے بلانے کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے مگر واقعی امی نے دل کا روگ پال لیا تھا اور وہ بہت جلد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ میں ماں کی وفات کی خبر بروقت ملنے کے باوجود منہ دیکھنے یا میت کو کاندھا دینے کیوں نہ

گیا؟ میں مانتا ہوں سراسر میرا قصور ہے مگر حالات وواقعات بھی میرے بس سے باہر تھے۔ والد اتنے ناراض ہوئے کہ مجھے عاق کر دیا اور کہلا بھیجا کہ ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ ٹانگیں توڑ دوں گا۔ انہوں نے ساری جائیداد سکینہ میری خالہ زاد، میری منگیتر کے نام کر دی۔ ادھر یہ کاروائی ہوئی ادھر خالہ کا اپنڈکس کا معمولی آپریشن بگڑ گیا اور وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ صدمات شدید تھے اور میں پردیس میں اکیلا اور مجبور، خود مجرمی کا شکار گھر سے دور ہوتا گیا۔ والد کے انتقال کی خبر مجھے بہت بعد میں ملی۔ بڑا تڑپا، رنج اٹھایا، سوچا اب جانا بیکار ہے۔ ماں باپ مرتے مر گئے۔ ان کا منہ نہ دیکھا تو اب کس منہ سے جاؤں اور کس کو منہ دکھاؤں؟ ماموں کبھی جاپان اور کبھی پاکستان۔ خاندان میں خالو اور سکینہ رہ گئے تھے۔ جب وہ بھی ناامید ہو گئے تو انہوں نے سکینہ کی شادی گوجر خاں کے قاضی خاندان میں کر دی۔ دولہا آرمی میں کپتان تھا۔ اب میں وطن جاتا بھی تو کہاں؟ خالو نے اپنی تنہائی کی بنا پر بیٹی داماد کو بھی پنڈی میں بلا لیا تھا۔ کیا میں گھر داماد کی موجودگی میں خالہ زاد کے سابقہ منگیتر کی حیثیت میں جاتا؟ کپتان قاضی کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ کھردرے مزاج کے تنگ نظر آدمی ہیں اور ان کے یہاں غیرت کا مفہوم بڑا مختلف اور عجیب وغریب ہے۔ جب ان کے بڑے بھائی کی ''منگ'' خاندانی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دوسری جگہ بیاہی گئی تو وہ اس کی سسرال میں گئے اور دولہا دلہن دونوں کو قتل کر آئے اور پھانسی کی سزا پائی۔

یہ باربرا ہی تھی جس نے مجھے تمام صدموں میں تھامے رکھا اور وہ سب آنسو جو بہائے نہ گئے، روک لئے گئے تھے، میرے سینے میں ابھی تک دفن تھے۔ ہمایوں نے کریدا تو اس کے سامنے اپنی بپتی بیان کرنے سے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔ ہمارے وہاں ولایت کا بڑا رومانوی اور مسخ تصور پایا جاتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مجھے بیوی اور سسر بہت اچھا ملا۔ میں یہاں جس طرح گھل مل گیا کیا باربرا اور اس کے والد ہمارے معاشرے میں کھپ جاتے؟ پھر میں نے اپنے دل پہ پڑا سب سے بڑا گھاؤ ہمایوں کے سامنے کر دیا۔ فیونا میری بیٹی مجھے بڑی پیاری ہے۔ مگر ہمارے

درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ کہنے کو اچھے برے کی تمیز رکھتی ہے۔ اپنے آپ کو پاکستانی کہتی' کہلاتی ہے اور اس پر شرمندہ بھی نہیں مگر اس کا رہن سہن بالکل یہاں کی لڑکیوں جیسا ہے۔ ہمایوں نے مجھے تسلی دی کہ اب وہاں بھی نئی ہوا چل پڑی ہے۔ سبھی مغرب زدہ ہیں، نئی تہذیب میں ڈھل گئے ہیں۔ گھر کے اندر کا رہن سہن تک بدل گیا ہے۔ وہ شاید مغربی کلچر کے ان امتیازات سے غیر واقف تھا جن کی باریکیاں مجھے سوئی کی طرح چبھا کرتی ہیں۔

ہمایوں کو فیونا سے ملنے کا بھی بڑا شوق تھا اور وہ مجھ سے زبردستی وعدہ لے رہا تھا کہ میں ایک بار' اس کے یہاں' اپنے وطن ضرور آؤں اور فیونا کو لے کر آؤں۔ فیونا کی غیر موجودگی میں اس کے بدلے وعدہ کرنا مجھے کٹھن لگ رہا تھا۔ اس کے آنے کا امکان تو رہتا ہی ہے کہ جہاں تہاں کا، فوری سفر اس کے پیشے میں روا ہے اور اسے میرے رشتہ داروں سے ملنے کا شوق بھی ہے۔ ہمایوں کی آمد کا سنے گی تو یقیناً آ جائے گی۔ میں نے ہمایوں سے کہا ''بہتر ہوگا کہ وہ تمہاری دعوت پر آنے کا وعدہ خود کرے۔ میں اپنی جگہ وعدہ کرتا ہوں کہ آؤں گا۔ میں سخت جو تر سا ہوا ہوں وطن کے لئے' اپنوں کے لئے مجسم انتظار' سراپا شوق و اخلاص!! ایک بار ضرور آؤں گا مگر ہمایوں مانتا ہی نہ تھا۔

ایک روز فیونا کو فون کیا، کہنے لگی میں اس وقت نہیں آسکتی۔ میری طرف سے آپ وعدہ کر لیجئے۔ کبھی پاکستان جاؤں گی مگر مستقبل قریب کے لئے وعدہ نہ کیجئے گا۔ اس نے دیر تک ہمایوں انکل سے گپ لگائی اور اپنی چرب زبانی سے یقین دلا دیا کہ وہ نہ صرف ان سے ملنے آئے گی بلکہ بہت دنوں تک ان کے پاس رہے گی۔ اگر اس کے منگیتر ٹونی کی زیر تکمیل فلم ہٹ ہوگئی تو وہ اس کے ساتھ پاکستان آ کر ایک فلم بھی بنائے گی۔

میں کوشش کے باوجود اپنے دوست کو نہ بتا سکا کہ مجھے ہنوز کیسے کیسے ذہنی صدموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیا میں ہمایوں کو وہ کہانی سناتا کہ میں خوشی خوشی فیونا کی راڈا (RADA-Royal Academy of Dramatic Arts) سے سند پانے کے بعد' پہلی فلم

سائن ہونے پر اس کے ہمراہ اسٹوڈیو گیا تھا۔ میں فیونا ہی کی طرح خوش اور اتنا ہی پر جوش تھا۔ پہلا شوٹ (شوٹنگ) تھا۔ ایک پارٹی کا منظر فلمایا جانا تھا۔ سب کے بیچ' سب کے ساتھ مگر سب سے نمایاں ایک جوڑا موسیقی کی لہروں پر تھرک رہا تھا۔ اچانک ایک نوعمر (Kissogram) لڑکی آتی ہے اور بے تکلفی سے بے لباس ہو کر مرد کے ہونٹوں کا بھر پور بوسہ لیتی ہے۔ میں فیونا کو اس رول میں دیکھ کر بڑا غضبناک ہوا تھا مگر مجھے ''سمجھایا'' گیا کہ یہ تو ایکٹنگ تھی۔ اس کے بعد میں نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔

ایک بار' اس کا اطالوی بوائے فرینڈ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ ایکٹر نہیں ہے۔ دونوں فلمی دنیا کے الگ الگ شعبوں میں ہیں۔ ان کی دوستی اس وقت سے ہے جب فیونا کچھ عرصہ کیلئے تھیئٹر میں کام کر رہی تھی۔ وہ تھیئٹر میں پروڈکشن کنٹرولر تھا۔ اب وہ ڈائرکشن میں آ گیا ہے۔ فیونا اسے سکھا پڑھا کر لائی تھی۔ وہ تمام وقت مشرق اور مشرقی اقدار کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اطالوی بھی پاکستانیوں کی طرح بڑے کنبوں (Extended family) کے عادی ہیں۔ انہیں کی طرح جذباتی ہیں۔ اکثر اونچی آواز میں (جھوٹ) بولتے ہیں۔ انہیں کی طرح خوشی میں اور دکھ پر کھل کر روتے ہیں۔ پول اس وقت کھلا جب اس نے یہ یقین دہانی کرانی چاہی کہ وہ شادی سے پہلے ''فل سیکس'' کا حامی نہیں!! وہ فیونا کی بہت عزت کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں یہ سب ہمایوں کو بتا دینا چاہتا تھا مگر یہ سب میری زبان پر نہ آیا۔ وہ ان الجھنوں کو کیا سمجھتا؟ وہ اپنی صدق دلی کا یقین دلاتا رہا کہ اس کے بلاوے میں کوئی بھید یا بھلاوا ہرگز نہیں۔ کوئی غرض اور مطلب نہیں۔ وہ میری ہی طرح مخلص ہے۔ اس کا بیٹا تاشفین فیونا سے چھوٹا ہے۔ ان کا جوڑ نہیں کہ وہ مجھے پھانسے گا۔ اسے کسی قسم کا لالچ نہیں۔ بس ایک خواہش ہے کہ میں ایک بار' اس کے کہنے پر وطن کا چکر لگا آؤں۔ فیونا بھی ہمارا وطن دیکھ آئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ''یہ لوگ'' ہمارے بارے میں خراب خراب تاثر رکھتے ہیں جیسے ہم درختوں پر رہتے ہیں۔ انہیں معلوم تو

ہو کہ ہم کیا ہیں؟ کیسے ہیں؟ وہ چاہتا تھا کہ فیونا پاکستان سے محض خیالی وابستگی اور مصنوعی لگاوٹ سے نکل کر سچی دل بستگی اور "فیل" (feel) حاصل کرے۔ ایسی ہی لچھے دار باتوں کے درمیان اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں فیونا کو لے کر ایک بار پاکستان کا چکر ضرور لگاؤں گا۔ اس سے بے نیاز کہ ایسا کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ اپنے کزن اور جگری دوست کی خاطر' اس کی رضا اور خوشی کے لئے وعدہ کرلیا۔ یہ سوچنا مناسب ہی نہ سمجھا کہ فائدہ کیا اور کیا نقصان ہوگا؟ چلو ایک بار جا کر ان گلیوں پر نگاہ ڈال آؤں گا جن سے بڑا جذباتی رشتہ اور وابستگیاں ہیں! ان گلیوں کے خواب تو دیکھتا ہی ہوں ایک بار زندگی میں' آخری بار' ان کا طواف بھی کر آؤں گا۔ وہ سب اپنا ہے' دشمن کا علاقہ تو نہیں!!

اتنی مدت بعد ملنا اور اس طرح ایک دوسرے پر اپنا اختیار چلانا بظاہر عقل سے بعید لگتا ہے مگر ہمارے درمیان رشتہ داری اور یاری کا بندھن ہی نہ تھا، ہم ایک دوسرے کے لیے کبھی لازم اور ملزوم تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ میرے پاس وعدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک ہفتہ کی طوالت ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہفتہ گزر گیا۔ ائیر پورٹ پر رخصت ہوتے ہوئے ہمایوں نے مجھے وعدہ کی یاد دہانی کراتے ہوئے ازسرنو پابند کیا۔ میں اس طرح کسی کو الوداع کہنے کبھی نہیں گیا۔ یہ لمحے بڑے نازک ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ سب گوارا کرنا پڑتا ہے۔

اور میرا دوست' میرا یار کزن ہمایوں چلا گیا۔

ہمایوں کو گئے ایک ہفتہ ہوگیا۔

ہمایوں کو گئے ایک سال ہوگیا۔

ایک اور سال نکل گیا ہے۔

کیا میں وطن جاؤں گا' جا سکوں گا؟

زوال' لازوال

صبح طلوع ہو رہی تھی۔

آسماں سے پھوٹتا اور زمین پر پھیلتا اجالا

اس کی نظروں سے اوجھل تھا کہ کھڑکیوں پہ ابھی پردے پڑے ہوئے تھے۔

زاری کی حالت میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔

نماز کے بعد وہ مراقبے میں چلا گیا۔

پھر'

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے،

لرزاں ہونٹوں سے پہلا ہی لفظ نکلا ہوگا کہ

بھاری پپوٹوں اور مقفل پلکوں کی باڑھ چیر کر اشک رواں کی نہر بے قابو ہوگئی ☆

بے وفانہ کوئی دوسرا.... وہاں تھا☆☆

وہ تو ہوگا

جو دکھائی نہیں دیتا مگر دیکھتا ہے۔

جس کی صدا نہیں پر معجزوں میں بولتا ہے۔

جس کی سماعت نہیں مگر سنتا ہے۔

شہ رگ سے قریب ہے!

کوہ اور صحرا اور سمندر میں،

سبزہ و گل میں'

شبنم میں'

مہیب و مقدس تاریکی میں'
کرنوں میں،
روشنی میں،
صدف میں'
پاک و معصوم دلوں میں'
نور،
ہر سو ہر طرف موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
اس نے،
اس نے کہا
اگر یہی مقدر ہے تو مجھے صدموں کے یہ پہاڑ اٹھانے' سہارنے کی طاقت دے' مولا!
برداشت کرنے کی قوت بھی عطا کر او بے پرواہ!☆☆☆
بسمل نہ بنا'
بخل سے کام نہ لے'
رحم کر، فضل فرما' اندھیروں میں' یاسیت میں ڈھل رہے لمحوں سے بچا!،

نیا ملک تھا'
اجنبی شہر میں وہ اکیلا!
اب یہاں اس کے بچے' ان بچوں کی اولاد ہے۔
اولاد کی اولاد،
جن کے نام یاد سے، شمار انگلیوں سے نکل رہا ہے۔

جب اکٹھے ہوتے ہیں'
ایک بھیڑ ہوتی ہے، میلہ سا لگ جاتا ہے۔
کوئی کمی نہیں۔
سب ہیں ۔۔۔۔۔۔

پھر بھی وہ اکیلا ہے!

اس نے تنہائی کی چبھن کو ناشکری جان کر توبہ بھی کی تھی پر اکیلے پن کی اذیت آتا جاتا سانس بن گئی تھی۔ اس سے چھٹکارہ نہ کوئی نجات تھی۔ زمین پر لیٹے لیٹے بدن اکڑ گیا۔ کروٹ لینی مشکل، اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ سوچ ہی مونس بنی، لپٹی ہوئی تھی۔ بہت دیکھ سن لیا۔ خوشی اور غم برت لیا۔ اس کے اندر بے سبب تمنا جاگی اے مالک! اٹھا بھی لے۔ اس دنیا سے جی بھر گیا۔"

جی بھر کر' اس نے زمرد کو دیکھا نہ تھا۔ ڈرتا تھا نظر نہ لگ جائے۔ گن گن کرتے دن، کومل راتیں گننے سے پہلے دزدِ پا اجل آئی اور جل دے گئی۔ چاند چہرہ زمرد کو چھین کر لے گئی۔ رہ گئی حسرت کہ سامنے بٹھا کر دید کیا کرتا' خواہ یہ لمحے لاطویل ہوتے! واقعی' اس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اس نے بیوی کو ڈانٹا نہ وہ روٹھی! میاں بیوی میں بھی کچھ ہوتا ہے۔ مہلت ہی نہ ملی جیسے اڑتے اڑتے پتنگ کٹ جاتی ہے ان کی بیاہتا زندگی انت ہوگئی۔ بے چاری' نو جوانی' نو عمری میں ناشاد گئی۔ تین سال میں دو ننھی منی نشانیاں' وچھوڑے کی سوغاتیں عدنان' عذرا یا پھر اپنی دکھ بھری بیماری کی یاد چھوڑ گئی۔

مغموم چھوڑ کر جانے والی محبوب صورت' زمرد کو' سپردِ خاک کرتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ بچوں کو کبھی ناخوش نہ ہونے دے گا۔ ان ننھے پھولوں کو کمہلانے مرجھانے نہ دے گا،

اپنے بچوں کو سنگل پیرنٹ بن کر نہیں پالے گا۔ واپس گیا تو سگے عزیز رشتہ دار ہمدردی کی دودھاری چھریاں چلا چلا کر بچوں سے اپنائیت ظاہر کریں گے اور بھیتر بھیتر کچوکوں سے محرومی و کمتری کا نمونہ بنا دیں گے۔ اس کا گھر بسانے کے بہانے کسی ایسی خاتون کو اس کے سر منڈھ دیں گے جو والدین پر بھاری ہو چکی ہو گی۔

پھر،

بچے سیانے ہوئے۔

یہ تو ہونا تھا مگر وہ بھی ہوا جو نہ ہونا تھا۔

اس کے پاس'

بس یادیں رہ گئیں۔

وطن یاد آتا' گھر یاد آتا!

وہاں سکھ تھا، آرام تھا۔ یہاں صبح سے شام کرنا مشکل تھا۔ یار نہ مددگار، شروع میں وہ جھنجھلایا کرتا۔ بچوں کو تیار کرنا، نرسری میں چھوڑنا، خود دفتر جانا وہاں سے آ کر گھرداری، چولہا چوکی! دیر گئے فرصت ملتی۔ بچوں کی وجہ سے دن میں تھوڑی بہت ''ہوم ہیلپ'' مل جاتی تھی۔ مگر رات کو دکھ بیماری میں وہی دونوں بچوں کو سنبھالتا۔ وحشت تھی، تھکن تھی اور وہ تھا! آہستہ آہستہ اس کا دل لگ گیا، بچوں کی محبت میں سرشار، اسے یہ سب اچھا لگنے لگا۔ کبھی بیٹا پیارا لگتا اور کبھی لگتا نہیں، اس کی جان تو بیٹی میں ہے۔ ویک اینڈ پر وہ مشین بن جاتا۔ بچے سو رہے ہوتے وہ لانڈری ہو آتا، جلدی جلدی استری کرتا۔ بچے اٹھتے' انہیں نہلاتا دھلاتا پھر وہ سب اکٹھے ناشتہ کرتے۔ عذرا ابو کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی، وہ کرسی کھینچ کر سنک تک لے آتی، اس پر کسی نہ کسی طرح چڑھ کر کہتی ''آپ اتنے ڈھیر سارے برتن نہیں دھو سکیں گے۔ یہ کام میں کرتی ہوں۔ آپ بھائی کے اسکول کا کام کرا دیجئے۔ وہ ''اچھا'' کہہ کر اس کے منے منے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا۔ عذرا سمجھتی وہی

بچ بچ برتن دھوتی ہے، وہ بڑے مزے کی باتیں کرتی۔

''ابو! نائٹ رائیڈر (Knight Rider) والی کار ☆☆☆☆ لے لیجئے''۔

''بڑی مہنگی ہے۔ مت بھولو اپنی کار بھی اس سے کم نہیں!''۔

''اچھا؟ کیا اپنی کار بھی اسی کی طرح باتیں کرتی ہے؟''

اور وہ اپنی جان سے پیاری گڑیا کو گھڑ گھڑ کر قصے سناتا۔ عذرا یہ سب درست مان لیتی۔ عدنان کبھی کبھی شک ظاہر کرتا' ٹھنک کر کہتا ''عذرا! ابو تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں، سب من گھڑت ہے، جب ہم کار میں ہوتے ہیں تب وہ کوئی بات کیوں نہیں کرتی؟''

''بھائی! آپ تو بے وقوف نہیں؟ کل پرسوں' ابھی تھوڑی دیر پہلے' آپ نے بھی کئی باتیں مان لی تھیں کیا آپ کے سوالوں کے جواب ابو کار سے پوچھ کر نہیں بتاتے؟ جواب تو کوئی نہیں گھڑ سکتا! عذرا عقل لڑاتی۔

چھٹی اور اتوار کے دن وہ انہیں کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا۔ ہائیڈ پارک تو اکثر ہی جایا کرتے۔ کئی دوست مل جاتے، سب کو معلوم تھا بچے اس کی کمزوری ہیں' اس کی پوری دنیا ہیں۔ بچوں کے بغیر اس کا تصور کرنا چھوڑ دیا گیا تھا۔ بچے ہر جگہ ہر مقام پر اس کے ساتھ ہوتے، دن تتلیاں بن کر اڑ رہے تھے اور یہ تینوں پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

اس روز جب عذرا نے اسکول سے آتے ہوئے کار اور اس کے درمیان مکالمے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ وہ حیران ہوا۔ اسے یاد آیا' کچھ عرصہ سے یہ موضوع ہی زیر گفتگو نہیں آ رہا۔ عدنان اسکول سے آ کر اپنے کمرے میں مشغول تھا۔ عذرا اپنے اور اس کے لئے چائے لینے کچن میں چلی گئی۔ عذرا چائے لے کر آئی تو اس نے مسکرا کر بیٹی کو خوشخبری سنائی ''تمہیں کل ہی نیا ڈریس لے دوں گا''۔

''ابھی پچھلے ہفتے' آپ نے سالگرہ پر اتنا شاندار ڈریس دیا ہے''۔

''بھولا تو نہیں، وہ مجھے یاد ہے''۔

''پھر!'' عذرا حیران حیران تھی۔

اس نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے کہا ''نئے ڈریس کی سفارش کارنے کی ہے''۔

عذرا کھلکھلا کر ہنس پڑی

''اب نہیں بنوں گی۔ ابو! میں بڑی ہو گئی ہوں!!''

بڑے وہ دونوں ہو گئے تھے، بہن کے ساتھ بھائی مل کر اپنے ابو کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ہفتے کو سب دیر تک سوتے۔ ناشتہ ناغہ، برنچ (بریک فاسٹ + لنچ) کیا جاتا سب مل کر ایسا پکوان بناتے جو صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا بدل ہوتا۔ اتوار کو بچے ذرا پہلے اٹھتے اور ابو کے لئے ناشتہ بناتے۔ روز و شب اچھے گزر رہے تھے۔ اپر اسکول میں گئے تو بچوں نے اور بہت سے کام اپنے ذمے لے لئے۔ لانڈری' استری' شاپنگ پر وہ ساتھ جاتے مگر کیا لانا ہے؟ اس کا دردِ سر نہ رہا تھا۔ وہ دفتر سے آتا' عمر کا تقاضا ہو گا تھک سا جاتا۔ کبھی عذرا کبھی عدنان چائے لا کر سامنے رکھتا۔ دونوں اپنی پیاری پیاری باتوں سے لبھاتے، اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ عدنان تھوڑا شریر تھا، کھلنڈرا تھا۔ پاکستانی والدین بچوں کو لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ تمیز سکھانے کے خیال سے ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتے ہیں یعنی کھلاؤ سونے کا نوالہ رکھو شیر کی نظر! بلکہ بعض پٹائی کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ وہ بھی بیٹے کو نادانی پر ٹوکا کرتا تھا۔ لڑکوں کو مرغا بنانا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔

لیکن یہ کوئی معمولی بات نہ تھی'

پہلی بار اسکول کی رپورٹ خراب آئی تھی، باپ نے عدنان کے کان مروڑنے کے بعد ایک طمانچہ جما دیا، ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑا ہو گا۔ دوبارہ ہاتھ اٹھتے دیکھ کر عدنان بچنے کے لئے پیچھے ہٹا تو میز سے ٹکرا گیا جس پر ابلے انڈے چھیلے رکھے تھے' انڈے فرش پر گر پڑے۔ قالین کا سارا رواں انڈوں سے چپٹ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک انڈہ مٹھی میں لے کر بھینچا اور سارا

ملغوبہ عدنان کے منہ پر مل دیا۔ عدنان بلک بلک کر رو یا۔ چوٹ لگی سو لگی منہ پر چپکا لجلجا انڈہ بہت برا محسوس ہوا ہوگا۔ اس کا رونا ایسا دہلانے والا تھا کہ عذرا بھی رونے لگی ۔ وہ خود بڑا رنجیدہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد عدنان سے ''سوری'' کہا۔ عدنان کچھ نہ بولا۔ دو روز تک چپ رہا خاموش اپنے کام سے کام رکھا۔ تیسرے دن تناؤ کم دیکھ کر عذرا نے ہنستے ہنستے شرارتاً شکایت کی ''ابو اسے کچھ نہ کہا کیجئے ورنہ یہ 999 ڈائل کر کے پولیس بلالے گا''۔ عدنان بہن پر جھپٹا مگر باپ نے پکڑ لیا اور پیار سے ڈانٹتے ہوئے جھوٹ موٹ اس کی ناک صاف کرتے ہوئے کہا ''بہت تنگ کرتی ہے آج کاٹ کر ہی پھینک دیتے ہیں! عدنان کا منہ لال بھبوکا ہو گیا، ابو کی گرفت سے بعجلت نکلا اور دور جا کر فرش پر سے کچھ اٹھا کر اپنے منہ پر لگالیا'' یہ کیا؟ یہ کیا؟'' عذرا اور ابو نے قطعی غیر متوقع حرکت پر ایک ساتھ پوچھا۔ ''آپ نے میری ناک اکھاڑ پھینکی تھی، زمین پر گرنے سے پہلے اٹھا کر واپس لگالی'' عدنان نے تڑ سے جواب دیا۔ عذرا ذرا حیران ہوئی پھر ابو کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگی ''عدنان میاں سچ مچ تمہاری ناک تھوڑی اکھاڑ پھینکی تھی''۔ عدنان سنبھل گیا تھا، جھٹ بولا ''تو۔۔۔ میں نے کب سچ مچ کی جان کر اٹھائی اور واپس لگائی ہے، جہاں تھی وہیں ہے!'' پورے ماحول پر بشاشت طاری ہوگئی۔

کل کا ہشاش بشاش بچہ عدنان جوان ہو گیا تھا عذرا بڑی خوبصورت، سگھڑ اور سلیقے کی لڑکی تھی ۔ باپ پر ایک نظر ڈالتی اور سب حال جان لیتی ''ابو آپ تھک رہے ہیں، چائے پیئیں گے؟''

''ابو کوٹ اور شوز اتار کر ایزی ہو جائیے، میں چپل لاتی ہوں، کپڑے بدل آیئے، استری کر کے ہینگر پر لٹکا دئے ہیں''۔

''رومال میلا تو نہیں ہوا؟ نکالئے دھو دوں''۔

عذرا کا یونیورسٹی میں پہلا سال تھا، اچانک ایک بہت ہی اچھا رشتہ آیا۔ لڑکے والے

پاکستان سے سیر و تفریح کے لئے لندن آئے تھے، دور کی قرابت داری تھی، انہیں عذرا پسند آ گئی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا اور بیٹی اپنے گھر چلی گئی۔

گھر میں، باپ بیٹا دونوں موجود تھے پھر بھی لگتا سناٹا ہے، رونق چلی گئی۔ روزمرہ کے معمولات بدلنے لگے۔ عدنان دیر سے آتا' کہتا یونیورسٹی میں دیر ہو گئی۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو آیا یہ غفلت کی نیند سو رہا تھا عدنان چابی گھر بھول گیا تھا یا گم کر آیا تھا۔ زور زور کی بیل بجی تو ہڑ بڑا کر اٹھا، دروازہ کھلنے پر الٹا عدنان بگڑا'' کچھ خبر ہے کب سے گھنٹی بجا رہا ہوں، پورا محلہ جاگ گیا'' اب یہ غصہ سے پاگل ہو گیا۔'' کیا وقت ہوا ہے؟ اتنی رات گئے شریف لوگ گھر آتے ہیں؟'' جانے اس کے اپنے منہ کی باس تھی یا عدنان کے منہ سے بھبکا آیا تھا۔'' کیا شراب پی کر آئے ہو؟'' اس نے آگے دیکھا نہ پیچھے جوان بیٹے کو ادھیڑ دیا۔

دوسرے روز عدنان گھر چھوڑ گیا۔ کھانے کی میز پر رقعہ پڑا تھا۔ رات پی کر نہیں آیا تھا اب پیوں گا کیا کر لیں گے آپ؟؟؟ وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ پھر جاننے والوں کی زبانی پتہ چلا عدنان گوری لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ تقدیر کا چکر ایسا گھوما کہ اس کی سوچنے کی حس مفلوج ہو کر رہ گئی۔ کسی نے سچ کہا ہے، جوان اولاد کا باپ بے اختیار ہوتا ہے، مجبور ہوتا ہے، دل کے ہاتھوں، حالات کی بنا پر، رسوائی کے ڈر سے کچھ کر نہیں پاتا! ناچار وہ بھی چپ ہو کر بیٹھ گیا' بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ دل لخت لخت تھا عقل ریزہ ریزہ تھی۔ اس نے بڑی محنت سے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر بچے پالے تھے۔ یہ امید نہ تھی کہ یوں اجڑ کر رہ جائے گا۔ کس سے فریاد کرتا؟ دوسرے والدین اس کے سامنے اولاد کے شکوے کرتے' گالیاں نکالتے یہ پھر بھی چپ رہتا۔ اس نے ٹھان رکھی تھی کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گا۔ یہاں کا ماحول ہی خراب ہے۔۔۔ فرار کا یہی تو ایک راستہ رہ گیا تھا کہ زمانے کو برا کہو اور بری الذمہ ہو جاؤ۔ واقعی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا؟ کہاں چوک ہوئی؟ بہت سے سوال آنکھوں کے

سامنے تیرا کرتے جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بے بس تھا کہ اس کا دل بچوں کے پیار کا مارا تھا۔

غم واندوہ کا مارا'

وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا۔

برف گھلنے کے کوئی آثار نہ تھے'

وہ دروازے پر' رات سے پڑ رہی برف کا ڈھیر دیکھ کر گھبرا گیا۔ مزید برف گرنے کا امکان تھا گویا گھر سے نکلنے یا اندر آنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ اس نے دفتر جانے سے پہل راستہ صاف کرنا ضروری سمجھا۔ برف ہٹائی' مشقت اٹھائی' بے حال ہو گیا۔ پسینہ پسینہ ہو کر اندر آیا، منہ سوکھ رہا تھا، سانس برابر نہ تھا، دھڑکن قابو سے باہر تھی، اس نے ایمبولنس بلائی اور ایمرجنسی میں (ہسپتال) چلا گیا۔ معائنہ کے بعد داخل کر لیا گیا، ٹیسٹ ہوئے۔ دل کا معمولی سا حملہ ہوا تھا۔ عدنان بہت یاد آیا ''اسے ہرگز خبر نہیں کروں گا'' عذرا بھی یاد آئی۔ فون کرتے کرتے رک گیا کہ یوں پریشانی میں اطلاع دینا ٹھیک نہیں' خواہ روک دوں مگر آئے بغیر نہ رہے گی۔۔۔ نہیں' نہیں اس کی گھرداری پر بوجھ پڑے گا۔

وہ گھر جانے کی اجازت نہ ملنے پر اداسی میں اونگھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد آنکھ کھل گئی' دیکھا عدنان سرہانے بیٹھا ہے۔ وہ اپنے ابو کی حالت پر خاموش رو رہا تھا۔ دوسرے مریض دونوں کو جذبات میں ڈوبا دیکھ رہے تھے، نرس آئی۔ اس نے پردہ تان دیا، گلے لگے تو باپ بیٹے کا دل صاف ہو گیا۔

دل تو صاف ہو گیا مگر عدنان پھر بھی گھر نہ آیا۔ جوان بیٹا' دل کا ٹکڑا' اس کا لخت جگر عدنان جانتا تھا کہ باپ ریٹائر ہو چکا ہے۔ اب ہمہ وقت گھر پر ہوتا ہے لیکن عدنان کو یہ سوچنے کی فرصت کہاں تھی؟ اس کی اپنی زندگی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ابو کو اب کوئی کام نہیں صرف اسی کا انتظار رہتا ہے اور وہ غنیمت سمجھتا ہے کہ بیٹا کبھی کبھی ملنے آ جاتا ہے۔ کاش اس نے

سنگل پیرنٹ بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا ہوتا کہ ایک روز وہ پیرنٹ نہیں صرف سنگل رہ جائے گا!!

ایک روز۔۔۔۔

عدنان آیا'

سونا گھر خوشیوں سے بھر گیا گویا موسم گل آیا۔ اس کے ہمراہ سلویا آئی۔

''آپ کی بہو' عدنان نے تعارف کرایا۔

''شادی کر لی؟''

''ایک بیٹا بھی ہے''۔

''کچھ بتایا بھی نہیں!''

تعجب میں وہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار بھی نہ کر سکا۔

عدنان خاموش رہا' سلویا بول اٹھی پہلے تو احتجاج کیا کہ باپ بیٹا ایسی زبان میں کیوں گفتگو کر رہے ہیں جو وہ نہیں سمجھتی پھر مزید تلخی دکھاتے ہوئے کہا'' مجھے معلوم تھا اولڈ مین نے تمہارا ٹانکا اپنی بھتیجی' بھانجی سے جوڑنے کا منصوبہ بنا رکھا ہوگا، یہ سب یونہی کرتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری فیملی مجھے کبھی Accept نہیں کرے گی۔ مجھے یہاں لے کر ہی کیوں آئے؟ اور وہ الٹے پاؤں چلے گئے۔ بے بنیاد بغیر اٹھائے، ایک اونچی سی دیوار درمیان آگئی۔

برسوں بعد' اچانک عذرا اور جمال نے آدستک دی۔ ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ''ابو ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے'' جمال کسی انٹرنیشنل ادارے میں ملازم تھا۔ وہ یہاں تین سال کے لئے' تبادلہ پر آیا تھا۔

اس کی کھردری اور بے مزہ و بے نور زندگی میں چپکے سے بہار آگئی۔ عذرا قریبی بستی میں رہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا عذرا اپنے بھائی سے' باپ کی صلح کرا دے۔ جانے وہ کیوں الگ

تھلگ سی تھی؟ پھر اسے معلوم ہوا کہ بہن بھائی آپس میں ملتے ہیں، تعجب تو ہوا کہ اسے بے خبر رکھا گیا۔ مگر یہ اچھا بھی تھا، اب وہ عذرا سے کہہ سکتا تھا کہ بیچ میں پڑ کر باپ بیٹے اور اس کے اہل و عیال میں حائل دیوار ہٹانے میں پیش رفت کرے۔ وہ قلباً مسرور ہو رہا تھا کہ سب مل بیٹھیں گے۔

وہ ملنے ہی گیا تھا۔ بیٹی ذلماد اور بچوں سے' اکیلے بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ ہمت ہوتی روز جاتا۔ اس کا دل چاہتا کچھ ایسا ہو کہ وہ بے وجہ روٹھ جانے والے بیٹے کے یہاں بھی جا سکے۔ وہ سلویا سے کہے گا کہ اسی نے سب غلط سلط اپنے دماغ میں بٹھا رکھا ہے۔ ایسی کوئی بات سرے سے نہ تھی۔ نالائق عدنان بھی بیچ میں نہ آیا۔

اچانک عدنان اور اس کی بیوی بچے بھی آ گئے۔

ممکن ہے اطلاع کر کے آئے ہوں۔ عذرا یا جمال نے ایسا کچھ ذکر نہیں کیا تھا بہر حال یہ بڑا خوش ہوا۔ دوہتوں کو چھوڑ کر پوتوں کی طرف بڑھا مگر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ بہو نے سلام کیا نہ بیٹے نے! یہ مسمسا کر رہ گیا۔ رنجیدہ ہوا، غصہ آیا، پر خاموش رہا۔ عدنان کے جانے کے بعد وہ بیٹی پر برس پڑا۔

میری پیٹھ پیچھے بھائی سے ملتی ہو۔ تمہارا فرض تھا اسے سمجھاتیں' معافی منگوا کر صلح کراتیں۔ سلویا کے روکھے سوکھے اور خراب رویہ پر بھی تم لوگ کچھ نہ بولے۔

وہ جانے کیا کیا بکتا جھکتا رہا۔

کچھ دیر بعد محسوس کیا جمال خفگی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا ہے اور عذرا بھی درشت لہجہ اختیار کر چکی ہے۔

''ابو آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں''۔

''ہاں! میرا حق ہے یہ''۔

''اب میں بچی نہیں ہوں''۔

''بچی ہی تو ہو تم میری! اتنی بڑی نہیں ہو گئی ہو کہ مجھے تمہارے سامنے خاموش رہنا چاہیے''۔

''آپ میرے شوہر اور بچوں کے سامنے میری بے عزتی کر رہے ہیں''۔

''کیا عزت بے عزتی لگا رکھی ہے؟ ایک خون ہو کر غیر جانبدار بننا جائز ہے؟''

جمال بول پڑا ''میں دخل نہ دیتا مگر اس کا اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔ ہم ناحق یہاں آئے۔ کہیں اور تبادلہ کرا لیتا۔ عذرا راتوں کو اٹھ کر پہروں روتی ہے۔ آپ نے اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا ضرور کیا مگر حقیقت ہے کہ آپ بہت سخت گیر تھے''۔

اس نے اپنا ٹاپ کوٹ لیا اور گھر آ گیا۔ یہ سب غیر متوقع تھا۔ گویا اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ جن پر جان چھڑکتا تھا وہی اب اس سے متنفر ہیں۔ عدنان ہی نہیں عذرا بھی۔۔۔ کبھی برسوں برساتوں میں گھر کا، جھڑکا ہو گا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے عذرا کو شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو۔ اس پر ہاتھ تو ایک بار بھی نہ اٹھایا تھا۔

وہ یہ صدمہ بھی سہہ گیا کہ وقت وقت کی بات ہے۔

وقت کا کیا ہے؟ کسی کا انتظار نہیں کرتا پل پل کر کے مدت بنتا چلا جاتا ہے۔

مدت بعد' دل سے مجبور، ایک روز پھر وہ بیٹی کے یہاں چلا گیا۔ مبادا وہی کچھ زیادہ حساس نہ ہو گیا ہو؟ واقعی ایسا ہے یا وہم ہے کہ بچے پرے پرے پھر رہے ہیں اور عذرا اور جمال کی نشست و برخاست سے سرد مہری جھلک رہی ہے۔ اسے شرمندگی محسوس ہوئی کہ ناحق آیا۔ اتنے میں عدنان کا فون آ گیا۔ پہلے جمال نے پھر عذرا نے بھائی سے' بھابھی سے بات کی۔ فون بند ہونے پر، اس نے بیٹے کی محبت سے مغلوب ہو کر خیریت پوچھی۔ کچھ تجسس ظاہر کیا' کچھ کرید کی۔ عذرا نے برا منایا اور اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ یہ اپنی جگہ بیٹھا جلتا بھنتا رہا۔ جمال نے بھی

کوئی بات نہ کی۔ عذرا چائے لائی تو اس نے پوچھا ''کیوں بھئی خفا ہو؟ بیٹی نے جواب نہیں دیا۔ باپ نے تلخی سے پوچھا ''میرا آنا ناگوار گزرا؟'' عذرا بولی ''میں بیچ میں نہیں آنا چاہتی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ جمال اور میں کوشش کر چکے ہیں۔ عدنان اور سلمیٰ دونوں نے کہہ دیا ہے' دخل دیا تو تعلقات ٹوٹ جائیں گے''۔

ٹوٹ وہ گیا تھا' بکھر گیا تھا وہ۔ باپ تھا، اپنی دانست میں قصوروار بھی نہ تھا بلکہ اسے فخر تھا کہ زمرد کے اٹھ جانے کے بعد بچوں کی پرورش ماں اور باپ دونوں حیثیت سے کی۔ ان کے بالغ ہونے تک' نگہداشت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہی پچھتاوا تھا، یہی پریشانی تھی۔ ''آخر پتہ تو چلے کہ اس نے کون سا گناہ کیا ہے؟ کون سا ظلم توڑا ہے؟ جس کا بدلہ دیا جارہا ہے۔''

نیکی کا بدلہ یہی ہے کہ نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈبو دیا جائے!

چاہا اس نے بھی تھا کہ ڈوب مرے' بچے اب اسے آئینہ دکھانے لگے تھے!

اس روز جمال نے پھر سخت گیری کا طعنہ دیا تھا۔ ''آپ کی یہی بات ہمیں اچھی نہیں لگتی'' جمال نے کہا تھا'' آپ عدنان کی پٹائی کیا کرتے تھے؟ عذرا اپنی جگہ سہمی رہتی تھی۔ آج بھی آپ کے سامنے بولتے ہوئے اس کی جان نکلتی ہے''۔ وہ تڑپ اٹھا ''عذرا۔۔۔ عذرا! تمہیں کبھی چھوا تک نہیں اور تم نے مجھے سخت گیر بتا کر بدنام کر رکھا ہے۔ کھلائے کا نام نہیں رلائے کا نام ہو گیا'' اس پر غم و غصہ سوار تھا، بچپن کی مار پیٹ کوئی بچہ دل پر لکھ نہیں رکھ لیتا''۔ اپنی حرماں نصیبی پر اس کا دل رو رہا تھا'' عدنان حرامزادہ تھا پر۔ بیٹی! مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ دو انڈے' دونوں ہی گندے! مرنے والی مر گئی اور یہ نمونے' نشانیاں چھوڑ گئی''۔ جنون میں وہ بکتا چلا جارہا تھا۔ ''ابو! آپ میری مری ماں کو کوس رہے ہیں۔''

بات بہت بڑھ گئی، ماحول بگڑ گیا۔ وہ بھنا کر باہر آگیا اور گیٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ روح چیخ رہی تھی' پکار رہی تھی ''آؤ مجھے واپس اندر لے چلو۔

میں غصے میں بکتا رہا ہوں مگر میرے بچو! مجھے تم سب سے محبت ہے۔ کیا میری قربانیوں کا یہی صلہ مجھے ملنا تھا؟ اس وقت بھی دیکھو تو میری جھلمل آنکھوں میں فراک پہنے ایک گڑیا کھڑی ہے۔ وہ میرے لئے منے منے ہاتھوں میں چائے کا مگا لئے تول تول کر قدم رکھتی آ رہی ہے، کہیں چائے قالین پر نہ گر جائے۔ ادھر گول مٹول عدنان ہے جسے سبق یاد نہ کرنے پر ڈانٹتے ہوئے الو کا پٹھا، حرامزادہ کہا تو اسے بہت برا لگا۔ روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے استانی ماں کہتی ہیں جو گالی بکتا ہے وہی یہ سب ہوتا ہے!! نادان بچے کے بھولپن پر باپ کا غصہ رفع ہو گیا تھا۔ اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا تھا۔

خیال جھٹک کر حقیقت کی دنیا میں آ کر دیکھا وہ ابھی بیٹی کے دروازے سے لگا، کھڑا ہے۔ کچھ رفع دفع نہیں ہوا تم سبھی بڑے ہو گئے ہو۔۔۔ میرے باپ بن گئے ہو۔۔۔ میں، میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔۔۔ اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ شاید کوئی پاس سے گزرا تھا۔ وہ سنبھلا۔ اس نے شدید خواہش سے مغلوب ہو کر، پلٹ کر دیکھا۔ عذرا نہ جمال کسی نے باہر جھانکنے تک کی زحمت نہ کی تھی۔ وہ مایوس، مایوس بھاری قدموں سے کار تک آیا اور اپنے کنج تنہائی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رواں وقت کا دھارا رکا ہے نہ رکے گا۔ اسے کچھ خبر نہیں، عذرا اور جمال یہیں ہیں یا وہ واپس چلے گئے۔ عدنان کہاں اور کس حال میں ہے؟ اس کے کتنے پوتے ہیں؟ وہ سب کو فراموش کر بیٹھا۔ زمرد بھی یاد نہیں آتی۔ یہ کون سا عالم ہے؟ دل پر پتھر رکھ لیا۔ دامن سے ساری یادیں جھٹک دیں۔ انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا؟؟

ایک روز،

اس شہر کے جانے مانے سماجی لیڈر شیر افگن دو چار ہم وطنوں کے ساتھ آئے اور اسے ہیٹن کے نئے قائم ہوئے ایشیائی بزرگوں کے ''ہوم'' میں لے گئے۔ شیر افگن نے کہا ''آپ تعلیم

یافتہ ہیں۔دیکھئے یہ سب ان پڑھ اور گردو پیش سے بے نیاز اپنے ماضی میں لپٹے رات دن کس اذیت میں بسر کر رہے ہیں۔اپنا اخبار یہ پڑھ نہیں سکتے۔کسی سے انگریزی میں اپنی ضرورت تک بیان نہیں کر سکتے۔کوئی پرسان حال نہیں، بات کرنے کو ترستے ہیں۔کیا آپ ان کے لئے تھوڑا سا وقت نکال سکیں گے؟

اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔جیب میں اور کوئی سکہ ہی نہ تھا!

اس لئے، اس نے دیر تک، دور تک سوچا! زندگی کتنی بے رحم ہے! یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تن، من، دھن لٹا کر اولاد کو ولایت بھیجا پھر جدا نہ رہ سکے، محبت میں کھنچے آگئے۔شاید ان کے بچے نافرمان ہیں نہ باغی! روزی روٹی کمانے میں لگے محض مجبور ہیں۔صبح کام دھندے پر گئے، شام پلٹے، اپنی طرف سے وہ بزرگوں کو شاندار گھروں، آرام دہ صوفوں اور نرم و گرم قالینوں کی دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں۔بے خبر نہیں جانتے تنہائی میں یہ بوڑھے کتنے بے آرام، کس قدر بے چین رہتے ہیں۔دکھ بیماری ایک طرف چار دیواری میں گونگے قیدیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں بعض ہمت کر کے باہر نکلے لیکن گم ہو گئے، بھٹک گئے، گھر واپس نہ پہنچ سکے۔ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچا دیئے گئے۔ایک مرتبہ ایک مکان میں آگ لگ گئی۔مدد پہنچنے تک بوڑھا باپ اور بوڑھی ماں اندر ہی بھسم ہو گئے۔

یہ ''ہوم'' ان کے لئے تازہ ہوادار کھڑکی ہے، جس سے چھن چھن کر، امید اور روشنی کی کرنیں ان تک پہنچ رہی ہیں۔کچھ تو ہوا؟ اس نے سماجی کارکنوں سے وعدہ کیا ان مرجھاتی روحوں میں تازگی و دلچسپی پھونکنے کی کوشش کرے گا۔۔۔کیا خبر اس طرح اس کی اپنی تنہائی کے زخموں کی جراحت کا بھی سامان ہو جائے!

گھر آتے آتے،

وہ ایک نیا آدمی بن چکا تھا!

ایک ایسا شخص جسے تنہائی چاٹتی ہے نہ وہ کسی بھیڑ میں گم ہوتا ہے۔
اس نے نہایت متانت سے اپنے وکیل کو فون پر تاکید کی ''نئی وصیت تیار کرو، پرانی ساقط اور منسوخ
ہے''۔

☆ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔ اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو (منیر نیازی
☆☆ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)
☆☆☆ اللہ الصمد
☆☆☆☆ ایک پران امریکی ٹی وی سریئل (Kinght Rider) جس کے ہیرو
''ٹاکنگ'' کار مشکل وقت میں ہیرو کو بچ نکلنے کی ہدایات دیتی اور گر بتاتی تھی۔
اپنے وقت میں یہ سیریئل بچوں میں بڑا مقبول تھا۔

دو چار قدم

گھر سے نکلنے سے قبل' اس نے موسم کا اندازہ کر کے ہی کپڑے پہنے تھے۔ سڑک پر پہنچتے پہنچتے اسے گرمی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ڈک ورتھ روڈ اور الرٹن روڈ کے سنگم پر بنے منی راؤنڈ اباؤٹ سے دو قدم آگے رہوڈز نوٹ پر مڑتی سڑک پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے سوچا کہ سڑک پار کر ہی لے لیکن یکدم دائیں سے ایک کے بعد دوسری اور تیسری کار نمودار ہوئی اور تیزی سے اسے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے چڑھائی کی طرف چلی گئی۔ اس نے سوچا ''یہ سپاٹ ہمیشہ سے بڑا ''ڈاجی'' رہا ہے۔ راؤنڈ اباؤٹ بننے کے بعد بھی کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ یہاں اشارہ لگنا چاہئے ''وہ حال ہی میں پاکستان ہو کر آیا تھا جہاں ٹریفک لائٹس کو عوام اشارہ کہتے ہیں۔ وہ اپنے ایک بہت پرانے ساتھی سے ملنے ٹیکسی میں جا رہا تھا' علاقے سے واقف تھا۔ گھر کا پتہ پاس نہیں تھا مگر یہ معلوم تھا کہ اس کا دوست اب بڑا مشہور وکیل ہے چنانچہ ایک جگہ رک کر پوچھا' بتایا گیا مطلوبہ جگہ اشارے کے پاس ہے! اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''دور تک کوئی بڑا اشارہ یا نشان نظر نہیں آ رہا'' ڈرائیور نے اسے سمجھایا ''اشارہ ٹریفک لائٹس کو کہتے ہیں''۔۔۔ اسے ٹریفک لائٹس کا یہ ''ترجمہ'' اچھا لگا تھا لہذا ذہن میں بیٹھ گیا۔۔۔ تپش سے بدن بے چین ہو رہا تھا' چھٹکارہ پانے کے لئے اس نے پہلے ٹوپی اتار کر جیب میں اڑسی پھر ٹاپ کوٹ اتار کر بازو پر ڈال لیا۔ دوبارہ سڑک پار کرنے لگا تو شاں شائیں کرتی بائیں طرف سے گزرتی کاروں کی قطار لگ گئی۔ اس نے دل کو تسلی دی' ایسی بھی کیا عجلت ہے؟ ادھر ٹوپی' کوٹ اتارنے سے طبیعت کو کسی قدر سکون محسوس ہوا۔۔۔ اسے ایک اور ''لسانیاتی لطیفہ'' یاد آ گیا اس نے انہیں دنوں' وہیں۔۔۔ پاکستان میں مقیم اپنے نواسے سے کہا ''جاؤ غسل خانے سے میری عینک اٹھا لاؤ'' بچہ تھوڑی دیر بعد خالی ہاتھ آ گیا۔ اس نے جہاں عینک پڑی تھی' وہ مقام ذہن نشین کرایا۔ بچہ پھر خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ اس نے پوچھا

عینک ملی؟ وہ بولا ''ابھی تو غسل خانہ ہی نہیں ملا''۔

''وہ سامنے کیا ہے؟''

بچے نے کہا ''ہم اسے باتھ روم کہتے ہیں!''

ہلکی ہوا کے جھونکے کے لمس کے ساتھ ہی پشت پر درختوں کے جھنڈ سے چڑیوں کی ملی جلی آوازوں نے توجہ کھینچ لی۔ ان آوازوں میں فاختہ کی ''کوہو'' بڑی نمایاں تھی تازہ ہوا کا جھونکا بدن کو نہال اور پرندوں کی آوازیں کانوں میں رس گھول گئیں۔ اس نے سڑک پار کرنے کا نئے سرے سے ارادہ کیا تو اچانک نگاہ بیچ سڑک کسی چمکتی شے سے جا ٹکرائی۔ دو قدم پر تین سکے پڑے چمک رہے تھے۔ سڑک پار کرنے اور سکے اٹھانے کی نیت سے آگے بڑھنے لگا تو دائیں بائیں دونوں طرف کا ٹریفک نئے سرے سے رواں ہو کر رکاوٹ بن گیا، سہم کر جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ''کچھ بھی نہیں عمر ڈھل رہی ہے! ناتوانی نے بزدل بنا دیا ہے'' اس نے سوچا ''بالفرض وہ ٹریفک کا شور نہ سن پاتا بے دھیانی میں آگے بڑھنے پر حادثے کا شکار ہو سکتا تھا؟ وہاں زیادہ سے زیادہ پانچ دس یا بیس پنس کے یہی دو تین سکے پڑے ہوں گے یقیناً اتنی چھوٹی سی رقم کے لئے کسی قسم کا رسک لینا دانشمندی نہیں حماقت ہوگی۔ ''سکوں کو چھوڑو سڑک پار کرو میاں جی!''

وہ حیران ہو رہا تھا خواہ مخواہ ہر قسم کا خوف دل کے اندر گھستا چلا آ رہا ہے۔ وہ بے سوچے سمجھے اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈالے گا۔ اسے کوئی جلدی نہ تھی صحیح وقت پر ہی سڑک پار کر کے نیوز ایجنٹ سے اخبار لے لے گا، ساتھ ہی گھر پر اخبار کی ڈیلیوری کے لئے کہہ آئے گا۔ ہفتہ بھر کے لئے اسکاٹ لینڈ جاتے ہوئے وہ اخبار بند کرا گیا تھا۔ اب خبروں اور اپنے پسندیدہ کالموں کے لئے پیاسا سا تھا۔ دوسرے ٹی وی دغا دے گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں سبسکرپشن کی عدم ادائیگی کی بنا پر کئی چینلز بند ہو گئے تھے چنانچہ خبروں کی دید و شنید محدود ہو چکی تھی وہ جب تک آزاد چینلز کی تازہ ترین خبریں نہ دیکھ لے اسے چین نہیں آتا۔ خبریں۔۔۔ خبریں۔۔۔ کبھی کبھی وہ خود پر ہنستا، کسی قابل

نہیں مگر عالمی حالات پر ہر دم نظر رکھنے کا متمنی ہے۔

وہ چوکنا ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا پر سوچ کی دھار برابر رفتار میں تھی۔ اس نے آزاد چینل بحال کرا لئے ہوتے مگر کم بخت یاداشت کی خرابی کی بناء پر وہ اپنا پلاسٹک کارڈوں والا والٹ (بٹوہ) گلاسگو میں بیٹے کے ہاں بھول آیا تھا۔ بیچ میں ویک اینڈ آ گیا۔ پیر کو والٹ پوسٹ کیا جائے گا اس کے بعد اسکائی والوں کی ادائیگی ہو گی پھر ''دیو'' بحال ہو گا۔ اسی لئے اخبار خریدنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

سڑک پار کر کے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے یہ اچھا کیا کہ قریب سے گزرتے ہوئے بھی سکے نہ اٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً اس اسپاٹ پر پلک جھپکنے میں پہنچ جانے والے ٹریفک کی زد میں آ سکتا تھا۔ اگر جی نہ مانا اور سکے اٹھانے کی نیت قائم رہی تو واپسی پر سہی! اس نے فی الحال دماغ کو ٹھکانے سے لگا کر خواہ مخواہ کی سوچ سے نجات حاصل کی مگر اس خیال سے نکلا تو ماضی میں جا ڈوبا!

وہ جن دنوں ''بے کار'' تھا یعنی اس کے پاس کار نہیں تھی۔ وہ شہر سے گھر اور گھر سے کسی بھی جگہ کا دو تین میل کا فاصلہ ہمیشہ ہی پیدل طے کیا کرتا تھا۔ بس کے سفر کے لئے بھی گھر سے اسٹاپ تک تو چلنا ہی پڑتا تھا۔ اس پدیاترا میں کئی مرتبہ اسے سڑک پر پڑے ہوئے سکے ملتے جنہیں وہ اٹھا لیتا اور جمع کرتا رہتا۔ جب تھوڑی بہت رقم اکٹھی ہو جاتی تو وہ کسی نہ کسی چیریٹی کو بھیج دیتا۔ ایک بار مطیع الرحمان ہمراہ تھا۔ اس نے تعجب کیا کہ وہ سامنے ہی نہیں نیچے زمین پر دیکھتا ہوا چلتا ہے۔ کمال ہے دھول میں پڑے 'اٹے' گمشدہ سکے اسے نظر آ جاتے ہیں۔

نیک نام مطیع الرحمٰن پڑوس میں انگریزوں کے دو گھر چھوڑ کر رہتا تھا۔ دوسروں کو نیک بننے کی نصیحت کرتا رہتا۔ جب اس نے مطیع کے سامنے سکے اٹھائے تو مطیع نے بے ساختہ پوچھا ''یہ کیا کرتے ہو؟'' اس نے سادگی سے بتا دیا کہ وہ گرے پڑے سکے اٹھا کر نیوز ایجنٹ یا کسی

بھی دکان کے کاؤنٹر پر رکھے فلاحی ڈبے میں ڈال دیتا ہے۔ ایسا موقع نہ ملے تو جمع کر کے بچوں
کے کسی خیراتی ادارے میں بھیج دیتا ہے۔ مطیع اس کی بات سے مطمئن اور قائل نہ ہوا، الٹا سمجھانے
لگا تمہیں شاید معلوم نہیں یہ قانون کے خلاف ہے۔۔۔ اگر تم سکے اٹھاتے ہو تو جا کر پولیس اسٹیشن
میں جمع کرایا کرو'' اس نے جواب دیا تھا ''بھلا کوئی چند سکوں کے لئے یہ کشٹ اٹھائے گا؟! پولیس
اسٹیشن جانا اور قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری آنے پر معمولی سکے کاؤنٹر پر رکھ کر نیم خنداں
سپاہیوں کی نظروں میں احمق تصور کیا جانا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ کسی قسم کی ترغیب اسے اس مشق پر
آمادہ نہیں کر سکتی! اس جواب سے غیر مطمئن ہو کر مطیع نے کہا تھا کہ مقررہ مدت کے بعد کلیم نہ کئے
جانے پر وہ جمع کرائی گئی ''رقم'' کا حقدار بن جائے گا۔

وہ لالچی نہ تھا نہ سرے سے کسی حقیری رقم کا حصول اس کے دھیان میں تھا۔ اس نے تلخ
لہجے میں جواب دیا تھا ''یہ تو رادھا کے رقص کے لئے نو من تیل جمع کرنے والی بات ہوئی'' اس نے
اپنے دوست کی نصیحت' ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی۔ اسے اطمینان تھا کہ یہ کوئی
برائی نہیں ہے۔ بڑی رقم' مدتوں کا مدفون' گمشدہ یا خفیہ خزانہ کبھی ملا نہیں کہ وہ پولیس کو بیچ میں لاتا
یہ ایک ایسی بے وقوفی ہے جس کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔

دن پھرنے' خوشحالی آنے پر اس نے کار خرید لی تھی۔ کار کے استعمال نے اسے سڑک
پڑے ہوئے سکے اٹھانے، جمع کرنے اور چیرٹی میں بھیجنے سے چھٹکارہ دلا دیا اور یہ قصہ پرانا ہو گیا۔
وقت کی گرد میں دب دبا گیا۔

ایک مدت بعد اسے کتنا پرانا پرانا یہ سب کچھ یاد آ رہا تھا؟ دھوپ سے اس کا بدن پسیجنے
لگا تھا اور بازو پر ڈالا ہوا ٹاپ کوٹ انتہائی غیر ضروری بوجھ بن کر ستا رہا تھا مگر نیوز ایجنٹ کے یہاں
سے اخبار' بریڈ پولو (منٹ سویٹ) اور چیز اینڈ اونین پائی خرید کر نکلا تو آسمان پر بادل چھا رہے
تھے۔ دھوپ رخصت اور ہوا میں بڑی خوشگوار سی خنکی محسوس ہوئی۔ اس عمر میں (وہ ہمیشہ لفظ بڑھا

کے استعمال سے گریز کیا کرتا) پل میں سردی اور پل میں گرمی لگنے لگتی ہے۔ اس نے دل پر چاپا کہ اچھا ہوا وہ کوٹ لے آیا تھا بالفرض' زیادہ ٹھنڈی ہوا چلتی یا پھوار پڑتی ہے تو بھیگتے ہی چھینکوں سے ناک میں دم ہو جائے گا اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُسے ایک بار باہر نکلنے کا خمیازہ کئی دنوں تک کھانستے چھینکتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے گزارنا پڑتا! موسم کا کیا اعتبار؟ یہاں بندہ بندے پر بھروسہ نہیں کرتا۔

وہ اس مخمصے سے نکل نہیں پا رہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہوئے سکے اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ ماضی اس کے دماغ میں گھسا ہوا تھا۔ مطیع نے اسے سکے اٹھانے سے منع کیا تھا۔ وہ اس کا نیک و شریف دوست تھا لہٰذا اس کی بات اہمیت تھی چنانچہ اس نے شہر کی بڑی مسجد کے مولانا صاحب سے پوچھا تھا "گرے پڑے سکے اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟" مولانا نے فرمایا تھا کہ "نہیں اٹھانے چاہئیں"۔ اس نے پوچھا "اس میں کیا ہرج ہے؟" مولانا نے کہا "جس کی چیز گری ہو' وہ ڈھونڈتا ہوا آئے تو گم شدہ شے اسے مل جائے گی۔ کوئی دوسرا اٹھالے تو وہ محروم رہے گا" وہ مطمئن نہ ہوا۔ "۔۔۔ مگر کھونے والے کے دوبارہ آنے تک کیا ضروری ہے کہ سکہ پڑا ہی رہے۔۔۔ پیسے' کسی گمراہ یا شرارتی لڑکے کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان سے نشہ آور "گم" یا "پڑیا" وغیرہ بھی خرید سکتا ہے!" اس پر مولانا نے فرمایا "اس صورت میں پیسے اٹھا کر خیرات کر دینا مناسب ہے۔ پانے والے کو یہ سکے کسی حالت میں اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں ہے"۔

پھر حالات بدل گئے۔ کار کے استعمال کے ساتھ ہی شب و روز میں تبدیلی آگئی۔ باہر اور گھر کی آمد و رفعت کے اوقات بالکل بدل گئے۔ پیدل چلنے کا اتفاق کم سے کم ہو گیا۔ سڑک پر گرے پڑے سکے ملنے پر جمع کر کے بچوں کی کسی فلاحی چیریٹی میں بھیجنے کے بجائے' اس نے اپنے بنک کو مستقل ہدایت دے دی کہ اس کے کھاتے سے' مقررہ تاریخ پر فلاں فلاں فلاحی ادارے کو مخصوص رقم ارسال کر دی جائے۔

اس کے ذہن میں یاد کی کئی کرنیں اُگ آئی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ گھر سے نکلا تو مطیع الرحمان آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ اسے آواز دینے ہی والا تھا مگر کسی انجانے خیال کے تحت چپکا' پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ نکڑ پر، مطیع ایک جگہ رکا اور کچھ اٹھانے کے بعد ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ زمین پر پڑا سکہ یا کوئی شے اٹھا کر جیب میں رکھنے اور روانگی میں ذرا سا توقف تھا جس میں مطیع نے نہایت عجلت سے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ (شکر ہے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ اس کی وجہ سے شرمندہ ہوتا) پھر فوراً ہی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے چل دیا۔ اسے مطیع منع کرتا تھا۔ اب ایسی کونسی اشرفی مل گئی کہ ڈگمگا گیا اور جھٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لی؟ انسانی کردار کے اس تضاد پر وہ حیرت میں ڈوب گیا۔ سوچ میں گم ہو گیا۔

پل دو پل بعد وہ مسکرایا جس طرح ہم برف پر چلتے ہوئے پھسل کر گر پڑتے ہیں لیکن پھرتی سے اٹھ کر جھینپ مٹانے کے لئے ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ یہ بڑا میکانکی عمل ہوتا ہے چوٹ سے زیادہ یہ فکر ہوتی ہے کہ ہم پر کوئی ہنس تو نہیں رہا؟ ابھی ابھی اس نے بالکل ویسا ہی منظر دیکھا تھا۔ سب انسان ایک سے ہیں، کوئی شخص بے عیب نہیں۔ کوئی فرد، ایک بھی بشر شاید ان چھوٹی چھوٹی کمزوریوں، کمینگیوں سے مبرا نہیں! دوسروں کو نصیحت کرنا اور خود برعکس عمل کرنا عام دستور ہے۔ مطیع نے جس عجلت سے سکے اٹھا کر جیب میں ڈالے اور ادھر ادھر نظر گھمائی تھی وہ حرکت بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔ اس لمحے کو یاد کر کے وہ اس وقت بھی مسکرا رہا تھا۔

سڑک پر ٹریفک کم ہو چکا تھا اس نے دائیں بائیں دیکھا اور مطمئن ہو کر سڑک عبور کرنے کے لئے دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ اچانک ایک دودھ گاڑی آئی اور چھو گئی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ دودھ والا نہایت پھرتی سے' گاڑی سے اتر کر اس کی طرف آیا اور اسے گرنے سے سنبھال لیا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ دودھ والے کو تسلی ہو گئی کہ ''کسی'' کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس

نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''سوری! مجھ پر احتیاط لازم تھی۔ آپ کو چوٹ لگ سکتی تھی۔
ادھر پوری سڑک پر زیبرا کراسنگ بھی تو نہیں ہے!'' پھر اس نے نرم نرم دوستانہ لہجے میں کہا ''سر!
اپنا خیال رکھا کرو (Take Care)'' اور سڑک کے بیچ پڑے سکے اٹھا کر راؤنڈ پر چلا گیا۔

دھواں دھواں سی یہ زندگی!

میں پرویز مجید کو الوداع کہنے ائرپورٹ گیا تو پہلی بار احساس ہوا، اب ہوائی جہاز کا سفر عیاشی نہیں رہا بلکہ ٹیوب اور ریل کی مثال ہو گیا ہے۔ وہی بھیڑ بھاڑ اور افراتفری بھاگ دوڑ، آمدو رفت میں تاخیر اور بے قاعدگی! ہیتھرو پر ہجوم اس کے کناروں سے ابلا پڑ رہا تھا۔ اعلان پر اعلان ہو رہا تھا اور کچھ سنائی نہ پڑتا تھا۔ دھیان دے کر، بڑی مشکل سے سنا کہ پرویز کی پرواز میں چار گھنٹے کی تاخیر ہے حالانکہ ہم گھر سے انٹرنیٹ پر اور ٹریول یجنٹ سے پتہ کر کے چلے تھے کہ جہاز وقت پر اڑے گا۔

ہمارے گھر کے نزدیکی ٹیوب اسٹیشن سے ہیتھرو کا راستہ ہی پورے ایک گھنٹے کا ہے۔ اس وقفے میں کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے اور اگر جاتے تو وقت پر واپسی مشکوک۔ میں شاید پرویز کو چھوڑ کر واپس آ جاتا مگر وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا۔ مجھے گوارا نہ ہوا کہ اس موقع پر اسے تنہا انتظار کشی کے لیے چھوڑ جاؤں۔

ہم دونوں اکٹھے انگلستان آئے تھے۔ جہاز میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ایسا تعارف ہوا کہ آج تک نبھ رہی ہے۔ بریڈ فورڈ پہنچ کر ایک ہی مل میں کام شروع کیا میں تو جلد ہی سول سروس کا امتحان پاس کر کے ان لینڈ ریونیو میں کلریکل آفیسر لگ گیا۔ پرویز بدستور مل میں کام کرتا رہا۔ وہ یہاں رہنے کے لیے نہیں، کمانے کے لیے آیا تھا۔ مل کی شفٹوں اور اوور ٹائم کی وجہ سے اس کی آمدنی مجھ سے دوگنی، بسا اوقات تین گنا ہوتی۔ دو بچے تھے، کاغذات میں چار لکھوائے۔ یوں ٹیکس بھی مجھ سے کم دیتا تھا۔ شاید وہ تا دم آخر مل نہ چھوڑتا مگر مجبوری تھی مل بند ہو گئی۔ چھانٹی پر اچھے خاصے پیسے ملے اور پھر اس نے آمدنی سے بچا بچا کر اتنی رقم جمع کر لی تھی کہ وطن جا کر کاروبار شروع کر سکے۔ اسی بنا پر بیوی بچوں کو نہ بلوایا۔ دو چار سال بعد خود ہی مل آتا تھا۔ اس کا ارادہ مینوفیکچرنگ میں جانے

کا تھا۔ مینوفیکچرنگ کا مستقبل یہاں بھی شاندار تھا مگر اسے وطن بیوی بچوں کے پاس جانے کی دھن تھی۔ پرویز نے گھر فون کر کے تازہ ترین صورت حال بتائی تا کہ وہ لوگ آدھی رات کو ایئر پورٹ آ کر انتظار کھینچنے سے بچ جائیں۔ اس کے بعد ہم نے ایئر پورٹ کی اوپر نیچے دونوں منزلوں پر بڑی دیر تک مٹر گشت کی۔ کافی پی پھر ایک جگہ بیٹھ کر ماضی میں گم ہو گئے۔

پرویز مجید بڑا بھلا مانس اور مخلص دوست تھا۔ ہم میں کوئی تکلف نہ تھا مگر وہ بے تکلفی بھی نہ تھی جیسی لنگوٹی کے یاروں میں ہوتی ہے۔ اچانک پرویز نے پوچھا ''یار تم نے کبھی عشق کیا؟'' گو مجھ پر اس اچانک سوال کی وجہ تسمیہ نہ کھلی اور یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ عشق سے کیا مراد لیتا ہے مگر کوئی حرج نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا ''ہاں! جس سے عشق کیا تھا اسی سے شادی ہوگئی۔ تمہاری بھابھی ہی میرا پہلا اور آخری عشق ہے۔''

''دھت تیرے کی!'' پرویز نے بڑی ادا سے نعرہ تاسف بلند کیا۔ دراصل اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ واقعی واپس جا رہا ہے۔ گھر والوں اور بیوی بچوں سے ملنے کی خوشی اس پر طاری ہوتے دکھائی رہی تھی اس کی بول چال میں ایک نشہ آ گیا تھا۔

''عشق ہم نے کیا تھا'' پرویز نے بے تکلفی سے کہا ''جیسے ہی کوئی حسین چہرہ نظر آتا ہم فدا ہو جاتے، مرمٹتے۔

''پہلی لڑکی سے اظہار محبت کیا' وہ بے چاری غریب اور شریف گھرانے کی تھی' بولی ''ہم تو آپ کو بھائی سمجھتے ہیں''۔ دوسری جگہ دل لگایا تو اس نے گھبرا کر اپنے منگیتر کو پکار لیا۔ یک دم ایک موٹا تازہ پہلوان نما آدمی دوڑتا باہر آیا اور ہمارا گلہ اتنے زور سے دبایا کہ جان ہی نکل چلی تھی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی کہ ''ہم غلط گھر پر دستک دے بیٹھے''! کہنے لگا ''واقعی آپ غلط جگہ آئے۔ آئندہ اچھی طرح مکان پہچان کر دروازہ کھٹکھٹانا''۔ پرویز موڈ میں تھا ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا ''تیسری مرتبہ نیت عشق کی تو لڑکی کھڑکی سے انتظار کا اشارہ کر کے غائب ہوگئی۔ میں تذبذب میں

پڑ گیا مگر ٹلنے کو من نہ چاہا کہ تھی وہ کوئی چاند کا ٹکڑا! ڈھیٹ بن کر دروازے پر یوں کھڑا ہو گیا کہ اگر بالفرض فرار ہونا پڑے تو ٹھوکر کھائے بغیر سیدھا سڑک پر اور وہاں سے یہ جا وہ جا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اندر سے ایک بڑی عمر کے شریف صورت بزرگ ڈولتے آ گئے اور بڑے پیار سے کہا ''آؤ میاں اندر چلے آؤ'' پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا ''کوئی تکلف نہیں آ جاؤ''۔ میں سمجھا ان کو کسی جاننے والے کا مغالطہ ہو رہا ہے۔ اب ہاتھ چھڑا کر بھاگنے سے رہا' اندر چلا گیا۔ انہوں نے کھنکھار کر آواز دی ''بھئی! چائے وائے بھیجنا''۔

پرویز نے دفعتاً مجھ سے پوچھا ''تم کراچی رہے ہو نا؟ جہانگیر روڈ دیکھی ہو گی۔ وہیں کوارٹروں کا قصہ ہے۔ جب ایک لڑکا چائے لایا تو کھانے پینے کا اچھا خاصا سامان اور ٹرے میں دو نہیں متعدد کپ تھے۔ بزرگ نے پوچھا ''کہاں کے رہنے والے ہو؟ کوئی ملازمت وغیرہ تو کرتے ہو گے یا کاروبار ہے؟''۔

''میں سمجھا کہ ضرور ان بزرگ کو کوئی دھوکا ہو رہا ہے'' پرویز نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا جہاز کی اڑان تک یہ دلچسپ قصہ چلے گا۔ پرویز یک بیک پھر ہنسنے لگا۔ جب ذرا ہنسی پر قابو پایا تو اس نے فوراً ہی 'دی اینڈ'' کر دیا' کہنے لگا ''دوسرے کمرے سے کھسر پھسر اور اٹھنے بیٹھنے کی معمول کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس لیے خطرہ محسوس ہوا نہ کوئی تشویش ہوئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ بڑے صاحب نے دروازہ کھولا تو تین باریش سفید پوش قسم کے معززین اندر آ گئے۔ صاحب خانہ نے کہا ''مولوی صاحب آپ تو جلدی آ گئے۔ کوئی خاص مصروفیت نہ ہو گی؟'' پھر انہوں نے میری طرف اشارہ کیا ''ابھی تو میں نے ان کا نام بھی نہ پوچھا تھا۔ خیر آپ آ گئے ہیں، ضروری کوائف معلوم کر لیجے۔ ان کو ہماری صاحبزادی پسند ہیں، آپ بسم اللہ کر کے نکاح پڑھایئے'' پرویز نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور کچھ ہنستے ہوئے کچھ مسکراتے ہوئے کہا ''جانے ماندن نہ پئے رفتن والا معاملہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے عقد میں مسماۃ

نسرین وہاب آ گئیں'' پھر پرویز مجید نے بڑے نخرے سے جتایا ''ہم انہیں محترمہ کے پاس جا رہے ہیں جن کے عشق نے یہاں ولایت میں بھی نہ بھٹکنے دیا!''

ہوائی جہاز کی روانگی میں بڑا وقت پڑا تھا اور حکایت لذیذ ختم ہو گئی! اس نوعیت کی گفتگو کے بعد سیاستِ دوراں پر بات چیت خارج از امکان ہے۔ دیکھا جائے تو ہم دونوں کی شادی میں بڑی مماثلت تھی۔ فرق طبعیتوں کے مطابق اتنا ہی تھا کہ پرویز جوانی میں ہم سے زیادہ مہم جو تھا۔ اب وہ وطن جا کر صنعت وحرفت میں قسمت آزمائی کرے گا۔ ہم سال گنتے رہیں گے کہ کب ریٹائر ہوں گے اور کتنی پینشن لگے گی اور کیا ہم وطن جا کر وہاں دوبارہ جم سکیں گے؟ بیوی بچوں کا پتہ نہیں۔ بیگم تو بچوں کی طرف ڈھلک جائیں گی مگر ہماری زبردست خواہش ہے کہ گرمیاں یہاں اور سردیاں وہاں یعنی چھ ماہ ادھر اور چھ ماہ ادھر گزریں۔

اتنے میں پرویز مجید بڑی پھرتی سے اٹھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی کلمہ استعجاب ابھرا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بجھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ محجوب وشرمندہ ہی نہیں اداس بھی ہو گیا ہے۔ پوچھا تو کہا ''کچھ نہیں''۔

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'' میں نے اپنی طرف سے ماحول خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ پرویز ہنسا اور سکون آشنا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ''آج یہ کہانی بھی سن لو''۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا اس نے کہا ''یہ کہانی ایسی ہے کہ سنو گے تو مکمل ہونے سے پہلے اٹھنے نہ دو گے خواہ پرواز ہی نکل جائے''۔ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا ''پرواز میں اتنا وقت ہے کہ تم چاہو تو کوئی چھوٹا موٹا ناول پڑھ کر سنا سکتے ہو''۔

''اچھا تو سنو'' پرویز مجید خیالات جمع کرنے لگا''

''میں پنجاب کے ایک دیہات سے ہوں۔ ہمارے گاؤں میں ایک چوہدری شاکر حسین نام کے نیک انسان رہتے تھے۔ وہ کراچی میں ایک سرکاری محکمے میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر لگے

ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک اصول بنا رکھا تھا کہ گاؤں سے جو لڑکا میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے ان کے پاس پہنچتا وہ اسے کسی نہ کسی جگہ کلرک لگوا دیتے اور جو لڑکا تھرڈ ڈویژن میں میٹرک کرتا اسے چپڑاسی رکھوا دیتے کہ سوجھ بوجھ کے بعد خود ہی لوئر ڈویژن کلرک بن جائے گا۔ وہ جب جب گاؤں آتے پورا پنڈ ان کا استقبال کرنے اسٹیشن پہنچ جاتا۔ اسی شان سے انہیں چھٹیاں گزارنے کے بعد کراچی کے لیے رخصت کیا جاتا۔ وہ گاؤں کی پوری آبادی میں مقبول ترین شخصیت تھے۔ اتفاق سے میں میٹرک میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا لیکن میں ان کے پاس نہ گیا۔ اب کے جو وہ آئے تو انہوں نے میرے والد کو بلوا کر وجہ پوچھی' والد نے بتایا ''لڑکا ذہین ہے مگر امتحان کے دنوں میں سخت بیمار ہو گیا تھا پھر بھی جیسے تیسے امتحان پاس کر لیا۔ ڈویژن تھرڈ آئی ہے، وہ چپراسی نہیں بننا چاہتا''۔ چوہدری صاحب کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ میں نہ صرف لائق فائق ہوں بلکہ عزت نفس بھی رکھتا ہوں۔ مجھے بلایا' تاکید کی ''کراچی اولین فرصت میں پہنچو۔ کلرک بھرتی کرا دوں گا۔ اچھا کام کرو گے تو ترقی بھی ہو جائے گی نیز وہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ شام کی کلاسوں میں داخلہ لے کر پڑھائی جاری رکھ سکو گے۔ میں اپنے اصول سے نہیں ہٹتا مگر کبھی کبھی ذہین لڑکوں کے ساتھ رعائت بھی کرنا پڑتی ہے''۔

ہم باتوں میں لگے تھے ادھر معمولی وقفے کے بعد اعلان پر اعلان ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر قریبی کاؤنٹر پر گیا تاکہ معلوم کروں ہماری پرواز کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا گیا۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ جان چھوٹ جاتی۔ فلائٹ اب چھ گھنٹے لیٹ بتائی گئی۔ واپس آیا تو پرویز غائب۔ آس پاس نظر ڈالی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پرویز کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہانپتا کانپتا آیا' کہنے لگا میں کسی کو پہچان کر اٹھا تھا اور پھر چپ کر کے بیٹھ گیا تھا'' مجھے یاد آ گیا کہ کچھ دیر پہلے پرویز نے ایک سمت میں خاص زاویئے سے نگاہ کرنے کے بعد کوئی استعجابی کلمہ کہا تھا کہ مگر اٹھتے اٹھتے ڈھے گیا تھا۔

''ہاں یاد آ گیا۔ اگر میں غلط نہیں تو تم اس لمبے شخص کی بات کر رہے ہو جو ایک بہت ہی

خوبصورت خاتون کو وہیل چیئر میں بٹھا کر بگٹٹ چلا جا رہا تھا'' میں نے پوری نشاندہی کر دی۔

پرویز بولا '' دراصل میں تو اپنی کتھا سنانے میں مگن تھا۔ بات لمبی اور بور ہو کر میرے ہاتھ سے پھسل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جاتے جاتے تمہیں بور کر رہا ہوں مگر تمہاری خوش قسمتی کہ اس کہانی میں نیا موڑ آ گیا ہے۔ تم سنو گے تو حیرت میں ڈوب ڈوب جاؤ گے''۔

'' سناؤ گے بھی کہ تمہید باندھ باندھ کر بور کرو گے''۔

'' پہلے یہ لو'' پرویز نے ایک بیگ سے دو میگنم چوکبار (آئس کریم) نکالے اور کہا کہ گلا تر کر کے سناؤں گا۔ سنو گے تو لطف آئے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے عجیب واقعات ہوتے ہیں لیکن معاف کرنا تھوڑا سا کسیلا تو ہو گا۔ بات جو شروع کر چکا ہوں اسے نمٹا لوں''۔ اس نے میرے ذہن نشین کرانے کے لیے دہرایا '' ویسے یہ نیا موڑ بھی اسی کہانی سے جڑا ہوا ہے''۔

اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ معلوم ہوا دو اٹھائی گیرے کسی خاتون کا بیگ چھیننے لگے تھے مگر خاتون بہادر تھی۔ مزاحمت کی۔ جلد ہی سیکورٹی گارڈز کی مدد سے اٹھائی گیروں کو پکڑ لیا گیا۔ قدرتی طور پر پرویز نے اپنے ہینڈ لگیج کو دیکھا اور نظروں نظروں میں گنتی کر کے مطمئن ہو گیا۔

'' میں کراچی پہنچتے ہی چوہدری شاکر حسین صاحب کے دفتر پہنچا''۔ پرویز نے نئے سرے سے بات شروع کی '' دن کے دوسرے نصف میں وہاں پہنچا تھا۔ چوہدری صاحب نے گھڑی دیکھی اور کسی جگہ فون کیا پھر چپراسی کو کہا کہ چوکیدار کو بلا لائے۔ چوہدری صاحب نے چوکیدار کو ایک سلپ دے کر کہا اس لڑکے کو اسمبلی کے سامنے والی بلڈنگ میں فرسٹ فلور پر شان خدا صاحب کے پاس پہنچا آؤ۔ انہوں نے مجھے تاکید کی '' فوراً پہنچو۔ وہ تمہیں چھٹی سے پہلے تقرری دے دیں گے۔ وہاں سوموار سے کام شروع کر کے مجھے اطلاع دینا''۔

'' تقرر نامہ لیتے لیتے شام ہو گئی۔ دوسرے دن ہفتہ تھا۔ اب سمجھ آیا کہ چوہدری صاحب نے پیر کا ذکر کیوں کیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دفتر بلکہ بلڈنگ خالی ہونے لگی۔ میں تو

سیدھا اسٹیشن سے چوہدری شاکر حسین کے پاس گیا تھا۔ آنے سے پہلے گاؤں کے کسی فرد کو اطلاع دی تھی نہ میری رہائش کا کوئی ٹھوڑ ٹھکانہ تھا۔ میری تو شام غریباں ہو گئی۔ دوڑا دوڑا چوہدری صاحب کے دفتر پہنچا۔ وہ جا چکے تھے سارا دفتر خالی ہو چکا تھا۔ چوکیدار بھی دکھائی نہ دیا۔ بڑا پریشان ہوا، وہیں گیٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ بیگانے شہر کی رات تو بہت لمبی ہوتی ہے! اتنے چوکیدار اندر سے آتا دکھائی دیا۔ وہ کھڑکیاں دروازے چیک کرتا آیا تھا۔ اسے اپنی پریشانی بتائی۔ معلوم ہوا چوہدری صاحب تو پیر کو دو روز کے لیے سرکاری کام سے لاہور چلے جائیں گے۔ ان کے گھر کا پتہ کسی کے پاس نہیں۔ وہ اصولاً گاؤں کے کسی آدمی کو اپنے دفتر میں نہیں رکھتے۔ میری بوکھلاہٹ پر چوکیدار کو ترس آ گیا۔ تسلی دی اور کہا ابھی لیبارٹری میں ایک صاحب اور ان کا چپراسی ہے۔ ذرا انتظار کرو۔ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ صورت یہ نکلی کہ صاحب تو سیدھے سیدھے چلے گئے۔ چوکیدار نے چپراسی کو روک لیا۔ مجھے تب معلوم ہوا کہ یہاں سرونٹ کوارٹرز چھڑے بابو لوگوں کو کرایہ پر دے دیئے جاتے ہیں اور خود چپراسی لوگ قریبی جھگیوں اور نالوں پر چھپروں میں رہتے ہیں۔ میں چپراسی کے ساتھ آیا۔ اس نے کوارٹر میں رہنے والے سے کچھ کہا سنا اور مجھے آ کر کہا کہ کمرہ تو ایک ہی ہے۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی آتی ہے۔ وہاں گورے رنگ کا لمبو پہلے سے رہ رہا ہے وہ چارپائی پر سوئے گا، تم زمین پر سونا منظور کرو تو چلو ملوا دیتا ہوں۔ جب تک ٹھکانہ ڈھونڈ نہ لو اسی طرح گزارہ کرنا ہوگا۔ خواہ دو دن بعد جاؤ یا مہینہ بھر رہو کرایہ پورے ایک ماہ کا دینا پڑے گا''۔

اب پرویز نے پہلو بدلا اور کہا ''بھائی! حیرت کے کانوں کی کھڑکیاں دروازے کھول لو بلکہ جگر تھام کے بیٹھو۔ ابھی جس گورے لمبو کا ذکر کیا اس کا نام کونین ہے۔ اسی کو دیکھ کر میں صاحب سلامت کے لیے اٹھا تھا۔ شاید تم نے بھی نوٹ کیا ہو مگر اس ظالم بے مروت نے منہ پھیر لیا، کہنا چاہیئے آنکھیں پھیر لیں۔ میں تین ہفتے تک اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہا۔ بڑی اچھی یاری

دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے اپنا رازدار بنالیا تھا۔ اب نظریں بچا کر یوں نکل گیا جیسے پہچانتا نہیں۔ اسے اچانک دیکھ کر جو خوشی ہوئی تھی ساری خاک میں مل گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ وہی حسین خاتون تھی جس نے ایک اچھے امیر گھر کے ناز و نعمت میں پلے لاڈلے کو سرونٹ کوارٹر میں پھنکوا دیا تھا۔

''اتنی پرانی بات ہے وہ واقعی تمہیں بھول گیا ہے ورنہ پہچان لیتا!'' میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' پرویز نے اعتماد سے کہا ''میں اس کے رازوں سے واقف، اس کی رگ رگ پہچانتا ہوں' پھر خود ہی بولا ''اس کے کنی کترانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت اس کے ہمراہ ''وہ'' تھی!'' میں نے بات اچکی ''چھوڑو اس بات کو تم اصل کہانی پوری کرو۔ کہیں انجام جاننے کے لیے مجھے بھی تمہارے ساتھ نہ جانا پڑے''۔ میری دلچسپی بڑھتے دیکھ کر پرویز خوش ہوکر بولا ''میاں اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی ویسے ان دنوں سیٹ نہیں ملتی۔ اس خادم نے ایک ماہ پہلے بکنگ لی تھی۔ اچھا دیکھو تو کتنا وقت رہ گیا'' پھر خود ہی گھڑی دیکھی اور بیان کرنے لگا ''بالکل شروع کی بات ہے ایک رات میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے میں دیکھا چارپائی خالی ہے، قریب ایک سایہ کھڑا ہے۔ جس حال میں وہ تھا اس کی وجہ سے میں مصلحتاً سوتا بنا رہا۔

مجھے آئے ہفتہ نہ ہوا ہوگا کہ ایک روز کوئٹہ کی ہوا چلی، مجھ پر سردی اثر کرگئی، رات گزارنی مشکل تھی۔ کونین نے ہی دیکھ بھال کی مجھے چارپائی دے کر خود زمین پر سویا۔ میں اس کی ہمدردی و تیمارداری سے بڑا متاثر ہوا۔ طبیعت صحیح طرح بحال نہ ہوئی تھی۔ اسی ہفتے میں، انہیں بے چین راتوں کے دوران' ایک بار پھر سخت پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ شاید میں نے پانی بھی مانگا ہوگا۔ ایک سایہ غڑاپ سے لحاف میں گھس گیا۔ میں پیاس بھول بھال گیا۔ تواہم پرست نہیں اور بیمار بھی ایسا نہ تھا کہ الوژن (نظر کا فریب) ہوا ہو۔ اس شبے سے دامن نہ چھڑا سکا کہ وہ

کونین ہی تھا۔ کچھ کچھ یہ شک بھی ہوا کہ وہ بے لباس تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں آنکھ لگ گئی۔ صبح وہ دفتر چلا گیا۔ میں ابھی اس قابل نہ تھا لہذا بستر پر پڑا رہا۔ ہمارے درمیان بات چیت نہ ہوئی ناشتہ تیار کرنا، خود تیار ہو کر دفتر جانا، صبح کا وقت بہت تنگ ہوتا ہے۔ کوئی بات ہو ہی نہ سکی۔ شام تک بھول بھال گئے جیسے رات گئی، بات گئی مگر رات تو پھر سر پر کھڑی تھی!

اس رات، پچھلی راتوں سے ذرا کم تاریکی تھی یا مطلع صاف ہونے کی وجہ سے نسبتاً کچھ روشنی رہی ہوگی۔ لگ بھگ وہی آدھی رات کا سمے ہوگا میری آنکھ پھر کھل گئی کونین کی پیٹھ دیوار سے لگی تھی۔ کونین میرے سامنے بالکل ننگا کھڑا تھا اس کی نیکر پیروں میں پڑی تھی۔ میری نظر دھیرے دھیرے گھٹنوں اور وہاں سے اس کی کمر تک گئی۔ وہ جانگیئے سے بھی آزاد تھا اور ایسی حالت میں تھا جس کا بیان نہ کرنا مناسب ہوگا۔ یہ تیسرا اتفاق تھا اور اب کسی شک کی گنجائش نہ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں آیا نہ سوجھا کہ معاملہ کیا ہے؟ بس دبکا پڑا رہا۔ ''گویا سویا ہوا ہوں! صبح اس نے خود ہی ٹٹولا'' بھائی! آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوتے ہیں، شاید!''

''نہیں'، مختصر سا جواب دیا'' اب تم اپنی چارپائی پر سونا''۔

''ایسی کوئی بات نہیں'' اس نے نظریں نیچی کر کے محجوب لہجے میں کہا۔

وہ نادم تھا۔ کلائی سامنے کر کے وقت دیکھا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا'' مجھے کامپلکس ہو گیا ہے۔ لوگ سوتے میں چلتے ہیں۔ میں کسی سزا یافتہ کی طرح کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اس حالت میں جاگنے پر، سو نہیں سکتا۔ لیٹنے سے وحشت ہوتی ہے۔ بڑی دیر بعد پُر سکون ہوتا ہوں، تب سوتا ہوں''۔ گویا اسے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر عریاں ہو چکا ہے!!

میں ڈاکٹر نہ ماہر نفسیات، رائے زنی سے معذور تھا۔ اس کا شانہ تھپکا یعنی اب تو دفتر جاؤ۔ اس نے ایسی زخمی نظروں سے دیکھا کہ میرا دل بس پگھل ہی تو گیا۔ وہ اٹھا اور ہاتھ ملا کر جلدی سے باہر چلا گیا۔ ایک بس نکل گئی تھی اور دوسری آنے والی تھی۔ میں سوچنے لگا اتنے بڑے

باپ کا بیٹا اور ان حالوں میں؟ یہ نوکری اس کو اپنے برتے پر ملی یا باپ کا نام ورسوخ کام آیا؟ اس کا بنے گا کیا؟ میری دانست میں کونین بہت بھلا مانس، نیک طینت اور خوش خلق لڑکا تھا لیکن میں یہ طے کر چکا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہم دیہاتیوں کی ایک الگ حس ہوتی ہے جو عام لوگوں کی چھٹی حس سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ میں جان گیا تھا کہ ایسے سرپھرے کے ساتھ رہنا مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ اس کے مسائل کتنے بھی جینوئن ہوئے، میرے بھی گلے پڑ جائیں گے اور میں کسی بات میں ملوث ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بہر حال ہم میں دوستی ہوگئی۔ اس نے، دھیرے دھیرے اپنے سارے راز کہہ ڈالے۔ میرے وہاں سے آنے کے بعد بھی راہ ورسم باقی رکھی۔ وہی ملنے آجاتا تھا۔

پرویز اچانک خلاء میں گھورنے لگا۔ میں اس کی طرف متوجہ تھا۔ شاید پرویز خیالات اکھٹے کر رہا تھا پھر اس نے گھڑی دیکھ کر اطمینان کیا کہ ابھی جہاز اڑنے میں دیر ہے۔ ''یار کیا بتاؤں؟ افسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی حالات کی دھارا یوں پلٹتی ہے کہ انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ کونین ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ بڑا لاڈلا ہوگا۔ نازونعم میں پلا ہوگا۔ اسے سرونٹ کوارٹر میں اس بے سروسامانی کی حالت اور الجھاؤوں میں دیکھ کر میں دکھی ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا اس کے والدین انتہائی شریف ہیں''۔ پرویز نے ایک بار پھر مجھ سے کنفرم کیا کہ میں کراچی سے ہی یہاں آیا ہوں اور بولا ''تمہیں شاید یاد ہو ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک کوٹھی مشہور تھی۔ اس کوٹھی میں کبھی کبھار مولانا مودودی آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کے نزدیک، قریب ہی، وہیں کہیں کونین کا خاندان رہتا تھا۔ ان کا ہمسایہ ایک مالدار تاجر تھا۔ مشہور یہ تھا کہ وہ ایک بار بمبئی گیا تو بے حد حسین، تعلیم یافتہ اور الٹرا موڈرن ''اسکورٹ گرل'' سے جا بھڑا۔ اس ماڈل کا نسبی تعلق کسی بڑے اونچے گھرانے سے تھا۔ اچھی خاصی مہنگی اور مشہور ماڈل تھی، دماغ میں ایک رات میں کسی ایشیائی ملک کے وزیر اعظم کی تنخواہ جتنی فیس لینے کا خناس سمایا ہوا تھا۔ جانے کیا چکر چلا؟

سیٹھ نکاح کر کے اسے ساتھ لے آیا۔ یہ سنا گیا تھا کہ نکاح سے پہلے سیٹھ بمبئی سے دو سیٹر جہاز میں لکھنو کے ایک پیر صاحب کی آشیر باد لینے گیا تھا۔ پیر صاحب کو طب میں بھی بڑا ملکہ تھا پیر صاحب نے ایسا تعویذ اور کوئی طبی نسخہ دیا کہ مس انڈیا سب کچھ چھوڑ چھاڑ، صاحب کی جوگن بن گئی۔ سیٹھ نے اسے اپنی پہلی بیوی سے الگ رکھا۔ نئی بیگم کے ساتھ ایک نوخیز لڑکی بھی آئی تھی۔ وہ اسے بہن بتاتی تھی مگر یہ کھلے راز کی طرح سب کی زبانوں پر تھا کہ کم سن حسینہ اس کی بیٹی ہے۔ نام صدف ہے۔ اپنی پری چہرہ ماں یا بہن جو بھی وہ تھی' اس سے زیادہ خوبصورت' نازک' کومل' سوہنی' من موہنی لڑکی ہمارے پورے ملک میں نہ ہوگی۔ وہ اپنے وقت کی ہیر تھی' پدمنی تھی! حسن سے متعلق ہر لفظ ہر صفت صدف پر صادق اترتی تھی۔ صدف کی کونین کی بہنوں سے دوستی ہوگئی۔ بہنوں کی وجہ سے کونین صدف سے الگ تھلگ رہتا تھا''۔

پرویز نے کروٹ بدلی اور دفعتاً اٹھتے ہوئے بولا ''چلو ایک ایک کپ کافی کا لیتے ہیں۔ میں بولتے بولتے تھک گیا ہوں''۔ میں بدمزہ ہوا کہ اس کی داستان سرائی میں جب ذرا دلچسپ موڑ آتا ہے فوراً کوئی حرکت کر کے تسلسل توڑ دیتا ہے۔ طوعاً و کرہاً ساتھ اٹھا۔ یوں میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت جو واقعات اہم ہوں گے اور توجہ جذب کرتے ہوں گے آج اتنی مدت بعد' ان کو دہراتے ہوئے، بیان ٹوٹ ٹوٹ جانا بالکل قدرتی ہے۔ خیر' ریستوران میں نشست ملنے پر بیٹھتے ہی اس نے داستان جہاں چھوڑ تھی' وہاں سے اس کا سرا پکڑ لیا ''کونین کے جتنے دوست احباب تھے وہ صدف کے بارے میں رنگین قصے سناتے جن سے معلوم ہوتا کہ وہ سب صدف کے ''فیض یافتہ'' ہیں۔ وہ لڑکی ہی بڑی نڈر تھی، لڑکوں کو ڈرا دھمکا کر کام نکالتی تھی۔ ملازم پیشہ شریف گھرانوں کے اکثر لڑکے والدین کے دباؤ میں ہوتے ہیں۔ آپس میں چاہے تبصرے کرتے ہوں مگر بات بڑوں سے چھپی تھی لہذا صدف بے دھڑک ان سب کے گھروں میں ان کی بہنوں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ وہ اتنی سندر اور حسین و خوبصورت تھی کہ جو دیکھتا اس کی نگاہیں خیرہ ہو جاتیں۔ صدف

جہاں جاتی بے مثال پذیرائی ملتی۔ اس پر ماں (بہن) یا نئے ڈیڈی کی طرف سے کوئی پابندی نہ تھی۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک اچھا خاصہ حلقہ پیدا کرلیا اور یہ سارا علاقہ اس کی سیرگاہ بن گیا جہاں چاہتی بے حجاب، بے تکلفانہ تعلقات بنالیتی۔

ایک مرتبہ صدف دو چار روز کے لئے کونین کی بہنوں کے ساتھ رہنے کے لئے ہی آ گئی۔ اس نے معصومیت سے اصرار کرکے اپنے لئے کونین کا کمرہ چنا، مجبوراً کونین کو ملحقہ گیسٹ روم میں اٹھنا پڑا جہاں وہ چند ضروری چیزیں لے گیا۔ عارضی سا قیام تھا اب کونین ہر چیز تو وہاں سے اٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ جب صدف وہاں نہ ہو تب جائے اور درکار کتاب یا مطلوبہ شے اٹھالائے۔ چالاک صدف تاڑ رکھتی جیسے ہی کونین اپنے کمرے میں کسی غرض سے جاتا یہ بھی وہاں پہنچ جاتی کبھی اس کی کسی بہن کے ساتھ اکثرا کیلی! کونین طبعاً شرمیلا اور صدف کا ہم سن مگر مقابلتاً نا تجربہ کار تھا پھر بہنوں کی وجہ سے صدف کے ''نیڑے'' آنا حرام سمجھتا تھا۔ صدف کے بارے میں پورے بلاک کے لڑکوں کے ''حلفیہ بیان'' بھی اس کی سماعت میں تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ صدف کی بے راہروی کا سبب اس کا حسن تھا۔ اس کا حسن ہی اسے لے ڈوبا اس کی سندرتا اور چنچلتا کے رعب تلے کوئی نزدیک نہ پھٹکتا ہوگا چنانچہ ہوشیار، چالاک صدف اس ''بے قدری'' کے ردعمل میں ساقی بنی اور شراب حسن لنڈھانے کی حد سے گزر گئی۔۔۔ وہ کئی بار، کونین کا مذاق اڑا چکی تھی ''خوب! آپ تو گھر میں پورے لباس میں مہمانوں کی طرح پھرتے ہیں اس طرح بندہ سمارٹ نہیں بور لگتا ہے۔ سینہ تو چوڑا ہے، آدھی آستین کی شرٹ پہنیئے تاکہ ''ڈولے'' دکھائی دیں''۔ کونین کی بہنوں سے بھی فرمائش کرتی کہ اپنے بھائی کی پرسنلٹی (شخصیت) سنوارنا اسے سمارٹ بننے کا گر سکھانا ان کا فرض ہے۔''

ایک شام موقع دیکھ کر صدف اکیلے میں کونین کے کان میں ڈال گئی کہ رات ساڑھے گیارہ بجے اس کے کمرے پر ''ناک'' کرنا (Knock) بڑا بور وقت گزر رہا ہے، مل کر ''ایکٹیوٹی''

(Activity) کریں گے''۔ پھر تاکید کرتے ہوئے جتایا خدا کے لئے ایزی ہو کر آنا، کبھی ''ڈنر ڈریس'' میں آ جاؤ! وہ باتوں باتوں میں دھمکی بھی دے گئی ''ورنہ۔۔۔ ہم آپ کی شکایت کر دیں گے بور بوڑم اور بدھو بدنام کر دیں گے''۔

''بے چارا کونین! پرویز نے بیان جاری رکھا'' میں بتا چکا ہوں کہ میری رائے میں کونین بہت ہی شریف لڑکا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے وہ معاملے کی نزاکت یا پیچ وخم میں پڑے بغیر صدف کے کہنے میں آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ صدف اسے ساتھ ملا کر' اس کی بہنوں کو رات میں بھوت پریت کا خوف دلا کر ''سکیر (Scare) کر کے ہنگامہ کرنا چاہتی ہوگی تا کہ پھر ان کا مذاق اڑا سکے۔ وہ مقررہ وقت پر کالی قمیض پتلون پہن کر آیا اور بالکل دھیرے سے دستک دی، صدف نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی بند کر دیا۔ کونین ٹپٹایا مگر مہمان کو ناراض نہ کرنے کے خیال سے کمرے میں گیا اور سلیپنگ سوٹ پہن کر آ گیا۔ اتنی عقل تو اسے تھی، یاد آ گیا صدف نے ایزی ہو کر آنے کو کہا تھا۔ ابھی دستک دینے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ادھر دروازہ کھلا کونین اندر داخل ہوا ادھر صدف جھپ سے بستر میں چلی گئی۔ یہ بے وقوفوں کی طرح دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا''۔

میں منتظر۔۔۔ اور پرویز چپ۔ ایئر پورٹ پر خلق خدا کا اس قدر زیادہ ہجوم تھا کہ بھیتر و انسانوں سے زیادہ آوازوں کا شہر لگتا تھا مگر پرویز کی خاموشی میرے لئے سناٹا بن گئی۔ ہم اس عمر میں نہ تھے کہ چڑھتی جوانی میں گرفتار مدہوشوں کی طرح امنگوں بھری شرارتوں اور اٹھکھیلیوں کی تفصیلات کا مزہ لیتے لیکن ایک کرید تو تھی کہ اس ساری داستان میں اگلے قدم پر کیا ہوا؟ نئی کروٹ میں کیا ملفوف اور مستور تھا۔ کڑی سے کڑی کیوں کر ملی؟ جب پرویز مجید نے چپ ہی سادھ لی تو اسے ٹھکورنا پڑا۔ وہ مدھم اور مرے مرے لہجے میں بولا ''یار! میں سوچ رہا ہوں کیا کہوں' کیا نہ کہوں بیان کو الفاظ نہیں مل رہے۔ سچ پوچھو تو میرا دھیان ماضی کے بجائے آج کونین میں جا اٹکا

ہے۔ اگر وہ کونین ہی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ وہ کونین ہی گزرا تھا' اس کی سرد مہری نے جہاں متاسف کیا وہاں الجھن میں بھی ڈال دیا ہے۔ عقل کام نہیں کر رہی' کونین اور صدف کے گھر والوں میں سمجھوتہ کیسے ہوا؟ آپس میں مفاہمت کیوں کر ہوئی ہوگی؟ ان میں ملاپ یا میل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ زیادہ حیرت اس پر ہے کہ صدف اور کونین اکھٹے کیسے ہوئے۔ وہ اس قتالہ کا کچا چٹھہ جانتا تھا' رام کیسے ہوا؟ ایک نہیں دسیوں سوالات ہیں جو میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں۔ وہ دونوں اکٹھے؟ یہاں' اس وقت' اس ایئر پورٹ پر کیا کر رہے ہیں؟ کہیں ٹرانزٹ میں تو نہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟'' شکل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پرویز مجید ایک خلجان میں مبتلا ہے۔ میں خود کھد بد میں پڑا تھا۔

''میرا دل کرتا ہے کہ انہیں ڈھونڈ کر حال احوال پوچھوں' قصہ کیا ہے؟'' پرویز نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے ادا کیا۔

''میری مانو تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ پلوں کے نیچے سے اتنا پانی بہہ گیا ہے کہ تم جو کڑیاں جوڑنا چاہتے ہو' ان کا ایک سانس میں جڑنا ناممکن ہے!'' میں نے اس کی سوچ کو توڑنے کے لئے اپنا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف کر کے ہلایا۔ وہ پلکیں جھپکتے ہوئے' بولا ''کونین سے جو ہمدردی یا محبت مجھے ہو گئی تھی' اس وقت اچانک جاگ اٹھی ہے۔''

''تم واقعی بہک رہے ہو'' میں نے اس کی توجہ ہٹانی چاہی ''برسوں پرانی ملاقات' وہ بھی چند دنوں کی اور تم کہہ رہے ہو' پرانی دبکی پڑی محبت اس وقت یک بیک جاگ اٹھی ہے؟''

''تم نے انگریزی کا وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ جب تم کسی سے محبت کرتے ہو تو ساری دنیا تم سے محبت کرنے لگتی ہے'' اس نے جواب دیا۔

''ایسا کرو کہ پہلے بات ختم کرو۔ اگر وقت ہوا تو دونوں ان کو تلاش کر کے خیر خبر دریافت کرلیں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے'' پرویز اب پھر ماضی کی طرف پلٹا ''مختصراً۔۔اس نے بات پھر ادھوری چھوڑ دی۔

اب کہہ بھی ڈالو'' میں جھنجھلا گیا۔'' الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کیونکہ وہ ایک معمولی بات سے زیادہ ایک خاص منظر تھا جس کا راوی کونین تھا' تو کیا بیان کو خاص الفاظ درکار نہیں ہوں گے؟''

پرویز نے اپنی مشکل بیان کی ''سب کہہ کہوا بھی دیا تو اس کا کوئی مطلب نکلے گا؟''

میں بور ہو کر چپ ہو گیا۔

''کچھ یوں ہے'' پرویز نے سلسلہ کلام از سرنو شروع کیا ''کمرے میں کونین تھا اور صدف تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ صدف نے بلا جھجک کونین کو کمبل ہٹا کر پاس آنے کی دعوت دی۔ کونین یہ دیکھ کر مبہوت ہو گیا کہ وہ بستر میں عریاں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور وہ ہکا بکا ہو کر ساکت و جامد کھڑا رہا۔ صدف ٹک دیکھتی رہی اس نے ایک بار پھر کمبل اوپر اٹھایا اور کچھ کہے بنا، اپنے پاس بلایا۔ کونین نے بمشکل ہوش و حواس جمع کیے۔ ''نہیں نہیں یہ بری بات ہے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔۔۔ میں آپ کو خراب نہیں کر سکتا۔۔۔'' صدف نے جلال میں آ کر کہا ''جھوٹے! تمہارے دل کا چور پکڑا گیا ہے۔ دیکھو! تمہارا بدن کپڑوں سے نکلا پڑ رہا ہے اور تم نیکی کا درس دے رہے ہو۔'' کونین زیادہ گھبرا گیا وہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور بک کچھ اور رہا تھا۔ صدف نے کڑک کر کہا ''تمہیں ننگا کر دوں گی تو پول کھل جائے گا۔ تم مجھے وعظ کرتے ہو' یہ خراب بات ہے۔ ذرا اتارو کپڑے! بے چارا ہے تو سیدھا سادھا جھٹ شرٹ اتار دی۔ ''قمیض نہیں۔۔۔ اور کونین بالکل ننگا ہو گیا مگر اب اس کی کپکپاہٹ کے ساتھ اس کے اندر بچی کچھی ہمت لفظوں کی صورت میں زبان پر آ گئی۔ ''میری جو بھی حالت ہے' ہے مگر میں خود کو بے قابو نہ ہونے دوں گا۔ میں دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں۔ ساری رات اسی طرح کھڑا رہوں پھر بھی بستر پر نہ آؤں گا۔۔۔ بقول کونین صدف رونے لگی۔ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی ''تمہیں میری توہین

کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ کونین جس حال میں تھا اسی میں کھڑا کھڑا بولا'' جذبات اپنی جگہ لیکن ان پر قابو پانا ہمارے بس میں ہے ۔ پلیز روؤ نہیں'' ۔ مگر صدف کا رونا کم نہیں ہوا ۔ اب کونین نے کہا '' اچھا میں آتا ہوں تو وہ اچھل پڑی '' میں بری ہوں، ہاں میں بری ہوں مگر اتنی بری بھی نہیں کہ آپ ایسے نیک کو خراب کروں'' اور کسی قدر بلند آواز میں بار بار ''نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں'' دہرانے لگی ۔ ۔ ۔

کونین نے اطمینان کا سانس لیا اور پاجامہ پہننے لگا کہ اچانک دروازہ کھلا اور کونین کے والد اندر آ گئے ۔ پیچھے کونین کی امی اور بہنیں بھی آ رہی تھیں ۔ انہوں نے چیخ کر بیوی اور بیٹیوں کو سختی سے روک کر واپس بھیج دیا ۔

اس کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ کونین کے ڈیڈی نے کونین کو قصووار سمجھتے ہوئے بغیر کپڑوں کے گھر سے نکال دیا ۔ گیٹ پر چوکیدار نے چھپ کر کونین کو اپنے کپڑے دیئے ۔ وہ رات کونین نے کسی دوست کے ہاں گزاری اور یوں اس کا نیا سفر سرکاری دفتروں میں ملازمت کرنے والوں کے سرونٹ کوارٹروں سے شروع ہوا ۔ ۔ ۔

میرا ابھی یہ خیال تھا کہ اگر کونین اسی ائیرپورٹ کے کسی گوشے میں ہے تو اس کو تلاش کر کے مل لینے میں مضائقہ نہیں ۔ کوئی اشارہ مل جائے گا ورنہ بقیہ کہانی صغیہ راز ہی میں رہے گی ۔ ۔ ۔ ہم دونوں ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اعلان ہوا پرویز کی فلائٹ روانگی کے لئے تیار ہے ۔ ہبڑ تبڑ مچ گئی ۔ قطار بنتے بنتے بے حد طویل ہو گئی ۔ پرویز قطار میں کھڑا ہو گیا ۔ کاؤنٹر پر تین چار افراد کام نمٹا رہے تھے ۔ پھر الوداع کہنے کی گھڑی آ گئی ۔ ہم دونوں گلے ملے اور جب تک پرویز نظروں سے اوجھل نہ ہوا میں وہاں کھڑا رہا ۔ کاؤنٹر پر تین چار افراد کام نمٹا رہے تھے پھر الوداع کہنے کی گھڑی آ گئی ہم دونوں گلے ملے اور جب تک پرویز نظروں سے اوجھل نہ ہوا میں وہاں کھڑا رہا اور ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے دوست کو'' خدا حافظ'' کہتا رہا ۔

وہاں سے فارغ ہوا تو کھٹ سے میرے ذہن میں کونین اور وہیل چیئر میں خوبصورت خاتون کا سراپا آ گیا۔ کچھ بے خیالی اور کچھ بے خودی میں، میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ نظریں جس یک سوئی سے کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس پر کانوں میں پروازوں سے متعلق پڑ رہے اعلانات گڈمڈ ہونے کے باوجود سماعت نے نہ جانے کیوں ''نیویارک کی پرواز تیار ہے'' کے الفاظ اچک لئے۔ ایک سمت میں ہلچل بھی دکھائی دی۔ نیویارک کے لئے مستعد کھڑے مسافروں نے متعلقہ کاؤنٹر کا رخ کیا اور جو مطمئن بیٹھے گپ لڑا رہے تھے وہ بھی قطار میں شامل ہونے کے لئے اٹھے۔ ناگاہ میری نگاہ دراز قد کونین پر پڑی۔ فوری تاثر تھا وہ آج بھی کسی جوان رعنا سے کم نہیں۔ دیکھو اور دیکھتے رہو! پھر نظر وہیل چیر پر پڑی، میں حلیئے سے پہچان گیا کہ کرسی میں صدف ہی بیٹھی تھی۔ وہ دور تھی مگر نگاہوں میں کھب گئی تھی۔ وہ لڑکی نہیں خاتون کا روپ لئے ہوئے بھی امرد وشیزگی کے بے پناہ ''لشکارے'' کی مالک تھی۔ حسن کا جادو سر چڑھ کر بولتا دکھائی دے رہا تھا۔

سبھی حسین نرالے اور ان پر مرنے والے متوالے ہوتے ہیں۔ میں تین میں نہ تیرہ میں مگر اک آگ سی اندر لگی ہوئی تھی۔ نئے سرے سے منکشف ہو رہا تھا کہ یہ وہ سحر ہے جس کے اپنے ہی رموز وقواعد واثرات ہیں۔ یہ مر کر جھیل سیف الملوک بن جاتا ہے، تاج محل میں ڈھل جاتا ہے، نیاگرا کا روپ لے لیتا ہے، بڑے بڑے شہنشاہوں کو سرنگوں کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ سیزر، انطونی، اشوک، جہانگیر، شاہجہان، باز بہادر!! بلخ بخارے کا شہزادہ مہینوال، ہزارے کا رانجھا اور ایران کا فرہاد سب اس کے سامنے بے بس ہاتھ باندھے پجاری! میری کیا حقیقت ہے؟ نظروں کا وارفتہ جھکاؤ آداب بجالایا، میں دونوں کو دیکھتا رہا، بس جھلک ایک پرچھائیں سی دیکھی تھی، جس کا تاثر بڑا گہرا تھا۔ تصور میں دونوں پیکر جم گئے تھے۔ صنف لطیف ومخالف دونوں کی بے پناہ خوبصورتی نے جکڑ لیا تھا۔ میں ازخود دعا کرتا رہا ''خدایا اس جوڑے کو کسی کی نظر نہ لگے'' میں پوری رفتار سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ قطار میں بہت آگے جا چکے تھے۔ میرا ان تک پہنچنا محال تھا

ایک ذرا سی آس تھی کہ شاید پلٹ کر دیکھیں تو میں والہانہ الوداعی ہاتھ ہلا کر ''رخصت بخیر'' اور خدا حافظ'' کہہ دوں گا۔ اپنی طرف سے اپنے دوست پرویز مجید کی جانب سے! مجھے یقین تھا کہ ہماری ملاقات پھر کبھی نہ ہوگی۔ میرے دل میں' بے اختیارانہ ہی ان سے متعلق خیر سگالی کے جذبات موجزن تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس گوشے میں داخل ہو گئے جہاں دوسروں کا داخلہ ممنوع ہے۔

مسافروں کے سوا کوئی دوسرا نہیں جا سکتا اور جہاں سے مسافر نظر بھی نہیں آتے۔

تب'

میں گھر واپسی کے لئے بھاری قدموں سے روانہ ہوا جیسے ایک نہیں تین دوستوں کو الوداع کہا ہے۔ میرے جذبات میں میٹھا سا درد اور چاہت بھری اداسی شامل تھی۔ نگاہوں میں کچھ پھول تھے، تتلیاں تھیں' جگنو سے اڑ رہے تھے اور دور تک دھواں پھیلا ہوا تھا۔

مجبوریاں

حسن کے چہرے سے اس کا دلی رنج وغم ظاہر ہو رہا تھا۔ ماتھے پر تیوری تھی، وہ سخت غصہ میں بھی تھا، وہ دروازے سے نکلتے ہوئے پھنکارا ''اب میں تم کو سمجھ گیا ہوں''۔ مظفر نے جواباً سنایا ''میں تمہیں پہلے ہی دن سمجھ گیا تھا'' پھر بڑبڑایا ''خواہ مخواہ کی ناراضگی' ناچاقی کوئی بات بھی ہوتی تو!'' واقعی بات کوئی نہ تھی حسن کے نکلتے ہی مظفر کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا وہ چاہتا تو دو قدم آگے ہو کر حسن کو پکار سکتا تھا۔ آخر حسن اسی کے گھر پر آیا تھا مگر وہ رک گیا۔ حسن نہ آیا یا پلٹ کر کوئی برا کلمہ بک دیا تو ناچاقی بڑھ جائے گی۔

بیچ ایک وسوسہ چپکے سے حائل ہو گیا۔

دراصل وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ عجب بچوں کا سا خلوص تھا لڑتے' بھڑتے پھر مل بیٹھتے تھے۔ دوستی نہ ہوئی خزاں اور بہار کا کھیل ہو گیا۔ ایک دوسرے کا مسلسل تعاقب ہو رہا ہے پر کوئی رت ایسی نہیں آتی' جب گلے لگ جائیں یا ایک دوسرے کو برداشت کرلیں' قرار پکڑیں۔ ادھر سیاست پر گفتگو شروع ہوئی کہ الجھ پڑے حالانکہ اس سبجیکٹ سے اتنا ہی شغف تھا کہ مخالف نظریات کے اخبارات پڑھتے تھے، کسی سیاسی جماعت کے رکن نہ تھے۔ بحث میں اتفاق کہاں ہوتا ہے؟ دوسرے مزاج جدا جدا تھے، دوست احباب بھی مشترک نہ تھے۔ اس لئے رنجش ہو جانے پر کوئی ملوانے والا نہ تھا۔ اگر ان کی بیویوں میں رشتہ داری نہ ہوتی اور گاڑھی نہ چھنتی تو شاید وہ ایک دوسرے کا منہ بھی نہ دیکھتے۔

اس شام' حسن نے فون کر کے شکوہ کیا ''تم ملنا چاہتے تھے تو نادر کو بیچ میں کیوں ڈالا؟ خود فون کیوں نہ کر دیا؟'' وہ جذباتی ہو گیا، جذباتی تو مظفر بھی تھا مگر اس میں ضبط وصبر زیادہ تھا۔ نہایت تحمل سے کہا ''آج آجانا۔۔۔ آؤ گے نا؟''

حسن کام سے سیدھا ہی آ گیا۔ ''دیبا کو ساتھ نہیں لائے؟'' مظفر نے پوچھا تھا۔ ''فون کر کے تیار رہنے کو کہا تھا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بولی کل چلیں گے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ بھابھی سے کہو سخت بھوک لگ رہی ہے۔۔۔۔ دیکھو! پورے ایک سال تین ماہ اور پندرہ دن بعد ملے ہیں۔ کڑوی بات نہ کرنا' خبردار جو دل دکھایا!'' حسن خاصا پرجوش اور فرینڈلی ہو رہا تھا۔ ''جیسے میں ہی تو لڑتا ہوں'' مظفر اوپری طور پر غرایا ''اکڑتے تم ہو، اندر کوئی ایسی سلگاہٹ ہے جو خون کے بدلے رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے' فوراً دوست سے دشمن بن جاتے ہو' الزام دوسروں پر رکھتے ہو۔''

یہ سچ تھا' حسن فنافٹ خفا ہو جاتا تھا، اس کا چہرہ چغلی کھاتا کہ وہ ناخوش' ناراض ہے! ناراض بھی وہ ذرا ذرا سی بات پر ہو جاتا تھا۔ روٹھ جاتا تو اسے منانا مشکل ہوتا۔ ادھر مظفر کو اپنے دھندے سے فرصت نہ تھی۔ صبح سے دکان پر مصروف ہوا تو رات گئے تک وہیں ٹنگا رہا۔ آج ملے، بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں مسرور تھے۔ باتوں باتوں میں' بالکل غیر ارادی طور پر' موجودہ سیاسی صورت حال پر گفتگو کا آغاز ہوتے ہی اختلاف ہوا اور معاملہ بگڑ گیا۔۔۔۔ حسن سامنے رکھے ہوئے کھانے کو ہاتھ لگائے بغیر نکل گیا۔

مظفر نے سوچا ''سالا انتہا پسند ہے! اڑیل' ضدی اور مغرور ہے۔ ذرا فراخدل ہوتا عمل و ارادے میں پختگی ہوتی تو یہی عیب خوبی میں ڈھل جاتا لیکن جانے کس مٹی کا بنا تھا ضد سے نہ ٹلتا تھا!''

یہ بھی کوئی بات ہے مظفر نے دلوں کی کدورت دور کرنے کے خیال سے ناراضگی کا سبب پوچھا' حسن بھڑ گیا' خفا ہو گیا من کے نہ دیا۔ روٹھا تو روٹھا ہی رہا۔ صلح میں کبھی پہل نہیں کی۔ مظفر سوچتا ''اس کا کیا قصور''؟ کبھی یہ بات بھی سوچا کرتا ''حسن کے مزاج کی مکمل پرکھ سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے جڑ پکڑی جائے ورنہ جھگڑا چلتا رہے گا''۔ یہ کہاں کا' وہ کہاں کا؟ کبھی

آپس میں لین دین نہیں ہوا۔ لہذا یہ سیم و زر کا ٹنٹا یا زن زمین کا قضیہ نہ تھا۔ ان کے درمیان سرے سے ایسا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ جن دنوں وہ اکٹھے مل میں کام کرتے تھے کسی بہانے صلح صفائی ہو جاتی مگر اب بقول حسن ایک سال تین مہینے اور پندرہ دن بعد ملے، نتیجہ وہی کہ تو کون، میں کون؟۔

آخر، مظفر نے نادر سے ذکر کیا۔ وہ بیچ پڑا تو برف کی درمیانی سل پگھلی۔ حسن، جیسے منتظر تھا وہ آیا تو مگر آئے دیر نہ ہوئی تھی کہ دوبارہ روٹھ رس کر یہ جا، وہ جا!!

مظفر اور حسن نے پورے دس سال ایک ہی مل میں کام کیا۔ ان کی شفٹیں الگ الگ تھیں تعارف حسن کے مظفر کی شفٹ میں آنے کے بعد نادر نے کرایا تھا۔ ان کی دوستی، دن بدن گہری اور گاڑھی ہوگئی۔ نادر ہلکے پھلکے انداز میں کہا کرتا ''ناحق تعارف کرایا ہم کنارے پر کھڑے رہ گئے اور یہ دونوں شیر شکر ہو گئے۔ حسن کا مظفر کے گھر بھی آنا جانا ہو گیا مظفر کی بیوی ریحانہ حسن کو چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتی اور اکثر اس کے حالات دریافت کیا کرتی۔ اسی کی زبانی مظفر کو معلوم ہوا کہ حسن ایرانی نژاد ہے۔ اس کا پورا نام حسن امانپور ہے۔ اس کے والدین برطانیہ میں سیاسی پناہ لینے کے بعد ایک پاکستانی کنبے کے ساتھ رہنے لگے۔ حسن کی پیدائش پر والدہ فوت ہوگئی۔ ابھی اس کا بچپن تھا کہ والد بھی جگر کے سرطان میں چل بسے۔ لاولد پاکستانی جوڑے نے حسن کو گود لے لیا۔ وہی اسکے سب کچھ تھے۔ بڑھاپے میں خرابی صحت کی بناء پر میاں بیوی وطن واپس جاتے ہوئے اپنا مکان حسن کے نام کر گئے۔ جب کبھی آئے وہی انگلستان آئے، حسن والدین سے ملنے کبھی پاکستان نہ گیا وہ پاکستان جاتے ہوئے ڈرتا بھی تھا، جانے وہاں کھپ سکے گا یا کسی جوگی کی طرح پھیرا ڈال کر خالی ہاتھ لوٹے گا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسا ہوا تو وہ بڑا اداس ہو جائے گا۔

ایران سے، حسن ایک تصوراتی لگاؤ رکھتا تھا مگر وہاں بھی اس کا کوئی نہ تھا ایک مرتبہ، منہ بولے والدین کی موجودگی میں، ان کی اجازت سے تہران گیا لیکن گھوم پھر کر لوٹ آیا تھا۔ نئی صدی

کے آغاز کے ساتھ ہی دنیا کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔کوئی ایرانی لڑکی اس کے انتظار میں نہ بیٹھی تھی کہ شادی کر کے انگلستان آنے پر آمادہ ہو جاتی ویسے حسن کو اپنی صورت' قد اور مردانہ کشش کے بارے میں خاصا مغالطہ تھا۔ وہ صحت مند' ملنسار' کماؤ اور فراخدل بھی تھا دراصل جب کوئی وطن میں اجنبی ہو جائے تو رشتے پھر سے جڑنے مشکل ہوتے ہیں۔

اس دوران مظفر چھانٹی میں آ گیا۔اس نے گولڈن ہینڈ شیک میں ملنے والی رقم سے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔حسن پر، ایران سے خالی ہاتھ آنا اور مل سے مظفر کا نکلنا بھاری پڑا۔وہ بڑا اکیلا اکیلا اور اداس رہنے لگا تھا۔ ریحانہ کو اس کی تنہائی پر بڑا ترس آتا۔وہ نیک اور شریف تھا۔اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ایک ضدی ہی تو تھا۔ ریحانہ کو امید تھی کہ شادی کے بعد بدل جائے گا۔ریحانہ کی ایک خالہ زاد بہن حسن کے منہ بولے والدین کے شہر میں ہی رہتی تھی۔اس نے بھی کسی بچی کو گود لیا تھا۔بچی دیبا جوان ہو گئی تھی۔حسن سے دو تین برس ہی چھوٹی ہو گی۔ریحانہ نے دیبا سے حسن کا رشتہ طے کرا دیا۔اس رشتہ پر حسن کے منہ بولے والدین بھی خوش تھے۔حسن کو یہ سب بڑا اچھا لگا۔ خوبصورت دیبا اسے پسند آ گئی تھی، وہ خوشی خوشی اسے بیاہ کر ڈیوز بری لے آیا۔

حسن اپنی دلہن دیبا کے ساتھ ڈیوز بری میں اور مظفر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ لیڈز میں رہتا تھا دونوں شہروں میں چند میل کا فاصلہ تھا۔مظفر اپنی نیوز ایجنسی کے لمبے اوقات اور مصروفیت کی وجہ سے شاذ ہی ڈیوز بری جاتا مگر حسن اور دیبا اکثر ہی لیڈز آیا کرتے بلکہ وہ اپنی شاپنگ اور گروسری تک لیڈز سے خریدا کرتے۔حسن اور مظفر گپ لگاتے، اتنے ریحانہ اور دیبا کسی بڑے اسٹور سے ضروریات کی اشیاء لے آتیں۔عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی کہانی بڑی مختلف تھی۔گھروں کی قربت اور آپس کی لگاتار آمدورفت نے حسن اور مظفر کی طبیعتوں کے فرق کو عیاں کر دیا۔حسن بے وجہ ہی الجھ جایا کرتا۔مظفر نے لاڈ سے پورا نام پکارا ''حسن امان پور'' نازک مزاج دوست برا مان گیا۔مظفر مذاق میں گنگنایا ''نادان کی دوستی جی کا جنجال!'' یار بھڑک اٹھا۔الزام لگا

دیا'' تفرقہ کرتے ہو، مغائرت برتتے ہو، ایرانی ہونے کے ناطے تعصب کرتے ہو، کم تر اور بے وقوف سمجھتے ہو''۔۔۔فل اسٹاپ!

یہ بھی کوئی بات ہے کہ لڑائی عراق ایران میں ہو اور میل ملاپ حسن اور مظفر میں بند ہو جائے؟ کوئی نظریاتی اختلاف نہ تھا، مزاجوں میں سہار نہ تھی، فہم کا فرق اور اپنی اپنی بات منوانے کا خبط تھا بس!

ایران اور عراق میں لاکھوں انسانوں کا لہو بہہ گیا۔ حاصل کسی کو کچھ نہ ہوا۔ جیسے تباہی دونوں ملکوں کا مقدر تھی۔ اِکّے برسوں بعد عراق پر امریکہ و برطانیہ حملہ کرتے ہیں۔ ادھر ان دونوں میں بحث چھڑ جاتی ہے۔ بحث اتنی بڑھتی ہے کہ جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ایک سال تین ماہ پندرہ دن بعد ملاپ۔۔۔ملاقات پھر تشنہ!

جس کی لاٹھی اس کی بھینس! امریکہ و برطانیہ نے عراق پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ دونوں دوستوں کا ذاتی تعلق عراق سے نہ تھا۔ بر بنائے اصول اپنے اپنے زاویئے سے بحث شروع ہو کر ذاتیات پر جا لگی تھی۔ فاصلہ ہو گیا، فیصلہ کوئی نہ ہوا، ان کے بیچ ایک ان چاہی دیوار حائل ہو گئی۔۔۔

انہیں دنوں، رات فرصت کی چند گھڑیوں میں مظفر ٹی وی کھول کر بیٹھتا ہے وہ سخت تھکا ہارا ہے کھانا سامنے چنا جاتا ہے۔ نگاہوں میں بھوکے پیاسوں کا انبوہ گھوم جاتا ہے۔ سخت بھوک کے باوجود ایک لقمہ نہیں لے سکتا۔ پانی پینے لگتا ہے۔ تو ہنستے بستے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں ہر سہولت سے محروم غربت کے مارے عوام کے تصور سے حلق میں کانٹے پڑ پڑ جاتے ہیں۔ کربلا کی پیڑ جاگ اٹھتی ہے۔ آنکھوں میں ان گنت افراد کی قطار ہے جو حملہ آوروں کے آگے بھیک منگوں کی طرح ہاتھ پھیلائے روٹی پانی مانگتے نظر آ رہی ہے۔ دشمن عالمی آداب کے برعکس قیدیوں کی عزت نفس کو ٹھڈے مار رہا ہے، برسرعام کپڑے اتروا رہا ہے، غیرت کیا ہے، بے غیرتی کیا ہے؟

حیا کیا ہے اور بے حیائی کیا ہے؟ ویت نام کی طرح یہاں بھی لاکھوں حرامی بچوں کی پیدائش سوالیہ نشان بن جائے گی؟ ایک بڑا شرعی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا؟ دشمنوں کی حملہ آوروں کی چال میں آ کر ان کے ٹٹوؤں کی ہمراہی میں درجنوں نادان اور بے وقوف لونڈے لارے لوٹ مار میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ سلام! اس قصباتی امام کو جس نے اعلان کر دیا کہ جب تک لوٹ کا مال واپس نہیں کیا جاتا وہ جماعت نہیں کرائے گا۔ ہر طرف دندناتے گورے فوجیوں کی ناک نیچے ''نصیب ماروں'' نے چوری کا لوٹ کا مال لا کر مسجد کے صحن میں ڈھیر کر دیا۔ دل و دماغ مختل ہے۔ فی الحال بم مارنے والے مسیحا بن کر مرہم رکھتے دکھائے جاتے ہیں۔ کون سا روپ سچا ہے؟ اس کے دل پر بوجھ ہے، غبار ہے، دم گھٹ رہا ہے، لبوں پر احتجاج ہے، وہ اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ مظفر یہ سب بھلانا اور غم ہلکا کرنا چاہتا ہے لیکن کٹے پھٹے' سہمے ہوئے اپنوں کے جیسے چہرے نظروں میں بموں راکٹوں اور مزائلوں کی زد میں آیا افغانستان بن کر چبھ چبھ جاتے ہیں۔ لکے چھپے خدشات ابھر ابھر آتے ہیں۔ صدیوں کی آبادیاں مٹ گئیں۔ بستیاں اجڑ گئیں۔ دو ہفتوں میں شہر کھنڈر بن گئے۔ جہاں کبھی زندگی قہقہہ زن تھی وہاں سسکیاں اور سبکیاں ہیں۔ آنکھ نم ہے دل غم سے بھاری ہے۔ اس کی یہ کیفیت تو افریقہ میں قحط کے دوران نہ ہوئی تھی۔ بھوک اور پیاس کا نہ حل ہونے والا مسئلہ تھا۔ انسانیت کی ایسی گھناؤنی تذلیل تو نہ ہوئی تھی! جی ہلکا اور صورت حال پر تبصرہ کرنے کی خواہش زور کرتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کبھی کبھی ہمکلامی مداوا بن جاتی ہے۔ اسے معلوم ہے اس ہفتے حسن کی ارلی مارننگ شفٹ ہے۔ وہ گھر ہے شاید اس کے فون کا انتظار ہی کر رہا ہو؟ کم از کم بے خطر تبادلہ خیال تو ہو سکتا ہے۔ وہ ایک دوجے کے لئے غیر تو نہیں۔ وہ آپس میں الجھتے ضرور ہیں۔ خواہ مخواہ بات بے بات جھگڑ پڑتے ہیں لیکن وہ امن و سلامتی کے حامی اور پیرو ہیں۔

وہ سہم اور ہچکچاہٹ پر قابو پا کر حسن کا فون نمبر ملاتے ملاتے رک جاتا ہے۔ بہت کنفیوزڈ

ہے! سوچتا ہے' ڈائل کرتا ہے' پھر سوچتا ہے مگر فون نہیں کر پاتا۔فون خاموش ہے۔ سہم کی دیوا
حائل ہے۔ ادھر مظفر ادھر حسن دبکا بیٹھا ہے!

ٹی وی پر نظر' نظر میں دھواں بھرا آسمان فضا میں راکٹ اور مزائلز دھماکے اور عمارتیں
گرنے کا شور ہے۔ اوپر آگ برس رہی ہے نیچے خون بہہ رہا ہے۔ چپے چپے پر ملبہ بکھرا پڑا ہے
انتہائی بے بس ہوکر لہولہان زخموں سے چور چور، بے دست و پا بچے، عورتیں، جوان و بوڑھے
ہسپتالوں میں تڑپ رہے ہیں۔ جسم بے حس' آنکھوں میں وحشت یاس و شلعگی کا محلول! سڑکوں
اور شاہراہوں پر طول، طویل قافلے رینگ رہے ہیں تصور' ادھر ادھر ان دفنائے کچھ مسخ لاشے ٹی وی
کی آنکھ سے جان بوجھ کر اوجھل رکھے گئے ہزاروں لاشوں کو بھی آنکھوں کی پتلیوں میں کھینچ لا
ہے۔ انسانیت کا قتل مسلسل ہو رہا ہے۔ مرہم' ادویات اور خون کہاں سے لایا اور مریضوں کو کیسے د
جائے؟ دوسری طرف آتشیں کلسٹر بموں کے ٹکڑے لگنے سے بدن سے رستا لہو نالیوں میں بہہ ر
ہے ہر سو تباہی اور غارت گری محیط ہے۔ بے گھروں دربدری کے ماروں پر رحم کھاتے' دور دراز
بیٹھے' مفلوج یہ خوف زدہ سے دونوں انسان دوست اپنے اپنے گھروں میں مجبور سہمے اور دبکے بیٹھے
ہیں۔ کل کی دھمکی' آج کی خبر' آئندہ کی سرخی۔۔۔ سب گڈمڈ ہے۔
فرش تا عرش' غرب تا شرق بے یقینی کی دریدہ چادر ہے۔ بے ردائی ہے۔ نارسائی ہے۔ خوف
و ہراس ہے۔ فوجیوں کا تالیوں سے استقبال ہے۔۔۔
مظفر ٹی وی بند کر دیتا ہے۔
شاید حسن نے بھی ٹی وی بند کر دیا ہوگا۔

پتوں پر تصویریں

اسے صرف اپنی تڑپن، اپنی چبھن اور خلش ہی یاد نہیں تھی، یہ احساس بھی تھا کہ وہ بھی گھائل اور زخمی ہوئی ہوگی!!

وہ ملے تو جانا کبھی نہ بچھڑیں گے۔۔۔ ملنا بچھڑنا! دستور ہے مگر بچھڑ کر ملنا اور پل بھر میں پھر جدا ہو جانا، فراق کا شکار ہو جانا کتنا دکھی کر سکتا ہے؟ جس نے کبھی، کسی سے محبت کی ہو، اسیر الفت ہو کر جیا مرا ہو، وہ قلب حزیں، دل فرقت زدہ کی نوکیلی چبھن اور تڑپن سے کیا واقف نہ ہوگا؟

صفدر کی زخشی سے جدائی کا انت ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

صفدر اونگھتے، اونگھتے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کلبلاتی سوچ، غفلت سوار، چھپے لکے خواب نے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے آتشدان گل، ٹی وی بند کیا اور اوپر آ کر لباس تبدیل کئے بغیر بستر پر گر پڑا۔ آنکھیں بند، نیند غائب! یہی گھروں میں یہی خرابی ہے۔ سونے کے کمرے اوپر کی منزل میں ہوتے ہیں۔ پہنچتے پہنچتے نیند اڑ جاتی ہے۔!

فاصلے پر، ڈبل گلیزڈ شیشے کی کھڑکی سے نشیب میں ایک بنگلہ نظر آیا۔ اس نے سوچا وہ رٹائر ہو کر کسی بنگلے میں منتقل ہو جائے گا۔ اس فرحت بخش خیال سے بھی ذرا سا سکون میسر نہ ہوا۔ پریشان ہو کر اس نے کروٹ بدلی۔ نیند نہیں آئی۔ وہ غیر شعوری طور پر کھسک کر پائینتی سے سرہانے کی طرف لڑھک گیا۔ دور، بڑی شان سے ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ کبھی برف پوش ہوتا ہے، ان دنوں سرسبز ہے۔ منظر بدل گیا۔ اوپر نیلاہٹیں دل لبھائیں، نیچے ہرے درختوں میں رنگ برنگ پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹیں!

ایک دم، یاد سات سمندر پھلانگ گئی۔ پرانے گھر میں کوئی درخت کوئی پودا کوئی گملہ تک نہ تھا۔ اسے کسی درخت کی شناخت نہ تھی۔ اب تو وہ سیب ناشپاتی اور آلو بخارے کے درخت پہچان

لیتا ہے! اسے اپنے بیک گارڈن کے کتنے ہی پودوں کے نام آتے ہیں۔ پرانی یاد جھٹک کر وہ واپس اپنے بستر پر ٹھیک سے دراز ہو گیا۔ مگر دل و دماغ میں جھن جھن ہو رہی تھی۔ عجب کیفیت تھی۔ غنودگی تھی، نہیں تھی! سامنے ڈال ڈال جھولے لے رہی تھی اور پتہ پتے سے دم بھر کو ملتا' تالی بجا کر جدا ہو جاتا۔ بوٹا بوٹا سائیں سائیں کرتا اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا' اس کی سماعتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا'' کہہ دوں تمہارے من کی بات؟'' جیسے وہ ایک ہمزبان درخت ہے' اسی منظر کا حصہ ہے۔ ان میں غیریت نہیں، اجنبیت نہیں۔! اس نے جھینپ کر آنکھیں موند لیں۔ جیسے سارے کا سارا باغ اس کا حال جانتا ہے' جیسے جانتا ہو!

خیال تھا' وہم تھا یا فریب و گمان تھا۔ لگا ایک پتے پر ایک موہنی سی تصویر ہے اس کی (کس کی؟) صفدر کی نگاہ وہیں جم گئی! شفاف و دلکش نقوش' پھول چہرہ' سمندر آنکھیں' عنابی لبوں کی منفرد قاشوں سے سجا دہانہ' گلاب گالوں پر کہیں کہیں شبنمی قطرے' سرو قامت' شہابی رنگت' پر کشش ہیولا! شعاعیں سی پھوٹتی اس کی طرف آ رہی تھی۔ سیدھی دل میں اتر کر' لبھا رہی تھیں' بلا رہی تھیں۔

تصور نہیں' اسی کی تصویر تھی۔ وہی تھی۔ اسے ذرا ذرا یاد ہے۔ رخشی کی شوخ متحرک آنکھوں کے حوالے سے وہ کہا کرتا اگر واقعی کالا جادو ہے تو ساری دنیا کے گوشے گوشے سے سمٹ کر اس کی بڑی بڑی متوالی آنکھوں میں آبسا ہے۔ رخشی کو اپنی غزالیں آنکھوں' ہرن آنکھوں پر بڑا ناز تھا۔

صفدر قسم کھاتا' ان آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

دیوانے ہو گیا؟ وہ ہنستی۔ سازینہ بج اٹھتا۔ نغمے بکھر جاتے۔ اس کی آواز میں سر' سحر اور شہد تھا۔ آواز کا کوئی رنگ نہیں ہوتا مگر اس کی آواز نقرئی' نہیں نہیں پیور' خالص قیمتی وائٹ گولڈ تھی۔ ان دونوں کو احساس تو ہو گا ان میں پیار ہے پر جیسے بے نیاز ہوں یہ پریم امنگ کیا ہے؟ نہیں

جانتے! وہ خاموش ہوتے ہیں پھر بھی بھیتر (باطن) بے آواز بولیاں بولتا ہے! کیوں؟ انہیں یہ سب پھرولنے کی فرصت کہاں تھی؟

وہ شام سہانی تھی۔ یونیورسٹی فنکشن میں دونوں نے قریب قریب بیٹھ کر بیک وقت سوچا کاش وہ آزاد پنچھی ہوتے۔ فضاؤں میں ہواؤں میں اڑتے' گاتے' پھرتے جیسے کل کائنات انہیں کے لئے تخلیق ہوئی تھی؟ انہیں کے لیئے آباد تھی لیکن وہ پرندے نہیں پڑوسی تھے۔ رخشی اونچی حویلی میں رہتی تھی اور اس کے زیر سایہ ایک معمولی چھوٹے سے مکان میں صفدر رہتا تھا اور فنکشن سے پلٹتے ہوئے جس چھوٹی سی کرٹسی لفٹ پر وہ بہت خوش تھے' آگے چل کر وہ کتنی بھیانک بن گئی تھی؟ تب وہ کتنے پریشان ہوئے' کتنی مشکل سے جان پائے وہ شام ایسی سہانی بھی نہ تھی!

یہ اتفاق تھا۔

رخشی کے والد خان بہادر بلگرامی نے انہیں یونیورسٹی گارڈن سے نکل کر گھر آنے کے لئے سڑک پر سنگ سنگ چلتے ہوئے دیکھ کر' پاس آ کر' کار روک کر لفٹ دی تھی۔ کہا تو انہوں نے یہ تھا وہ گھر ہی جا رہے ہیں پر یہ لفٹ بچپن کے دوستوں' دو پیار کرنے والوں کے درمیان ایک دیوار تعمیر کر گئی۔ خان بہادر نے اپنے وقار کے نام پر مال و دولت کے زعم میں اور اثر رسوخ کے زور' بل پر بڑی پختہ کاری سے دیوار چن دی۔

رخشی پر پابندیاں لگ گئیں۔ صفدر کی اماں نے بیٹے کو سمجھانا چاہا'' ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں میں دوستی کا رواج نہیں۔ بچپن کی بات دوسری ہے۔ جوان ہونے پر سیانے بچے خود ہی پرے پرے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر ایک رنگ آتے ایک رنگ جاتے دیکھ کر نرم لہجے میں یہ بھی کہا تھا'' تم جانتے ہو جو فرق ہے' اونچ نیچ ہے۔ ہمارے اور ان کے مکان پاس پاس ہیں لیکن ایک بلند عمارت' اپنے وجود میں ناقابل تسخیر تو دوسری کھنڈر اور پست۔ ہمارے اور ان کے درمیان حیثیت کی فصیل کھڑی ہے بیٹا۔'' تمہیں ایک بات بتاؤں'' یہ کہہ کر اماں

خاموش ہوگئیں۔خلاء میں گھور گھور کر سوچتی رہیں۔صفدر نے حواس جمع کر کے پوچھا تھا ''اماں آگے بتاؤ میں تمہاری بات سن رہا ہوں''۔اماں بڑی دیر تک چپ چاپ اسے' اپنے اکلوتے بیٹے صفدر کو خالی خالی نظروں سے تکتی رہیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ماں تو مجسم محبت ہے' ممتا ہے' پیار ہے، پھر کیوں چپ ہے؟ کوئی دل خراش بات ہوگی ورنہ خاموش نہ ہوتی۔ ماں کی باتوں کو وہ سمجھتا تھا لیکن اس کے نزدیک مال و دولت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ جس کے پاس پیسہ ہو۔وہی بڑا ہے' عزت دار ہے۔عزت' امیری سے نہیں اصول' ایمان اور انصاف سے ہے۔ ''اماں! صاف صاف کہہ بھی دو'' پھر وہ ہنسا ''اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مچلوں گا نہیں مجھ میں سہار ہے۔''

جیسے وہ جانتا تھا اماں رخشی سے ملنے سے روکنے کا ہی تو کہے گی۔تب وہ جھنجلائے گا نہیں!

اماں نے جو کہا' وہ اس کے خیال میں نہ تھا۔حد ادراک سے باہر تھا۔ان کے گھر میں اپنائیت کی ایک مکمل فضا تھی۔ وہ مل جل کر ایک چھت کے نیچے ایسے ہی رہتے تھے جیسے سب نارمل لوگ رہتے ہیں۔صبح ہوتی' شام ہوتی' کوئی اعلان نہیں ہوتا کہ سب ایک ہیں' ایک سے ہیں۔ سب اپنی اپنی ذات میں با اختیار ہیں۔وہ جس بندھن میں بندھے تھے وہ تکلف و امیرانہ تصنع سے پاک تھا۔ابا کبھی کسی واقع سے غیر متعلق نہیں رہتے تھے مگر لگتا یہی کہ وہ بے تعلق سے ہیں۔ان لمحوں میں وہ فکر مند بھی ہو جاتا۔شاید ابا پیدائشی دبو ہیں۔ وہ اس کا رشتہ لے کر کبھی بھی رخشی کے والدین کے یہاں نہیں جائیں گے۔مگر اس کے اندر سے ایک آواز آتی وہ بزدل نہیں، چپو ہیں۔جھگڑالو نہیں، کم گو ہیں۔اونچ نیچ سمجھنے والے مدبر ہیں۔بس! اپنی نمائندگی کا اختیار اماں کو دے کر، مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

اس روز اماں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔پل بھر میں' پردہ اٹھا کر' ابا کا اجلا روپ دکھا دیا!! اماں نے بتایا ''تمہارے ابا' مکرم بخاری' آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے جیل بھگتی،

پولیس کی مار کھائی مگر بھید نہ دیا۔ رہائی پر، قوم سے غازی کا خطاب ملا۔ اسی زمانے میں رخشی کے ابا سے چپقلش ہوئی اور ٹھن گئی۔ یہ محلے دار بھی تھے مگر ایک دوسرے کی شادی میں شریک نہ ہوئے۔ میرے آنے کے کئی سال بعد ایک بار پھر تو تکار ہوئی۔ گھروں میں ملنا پہلے سے بند تھا۔ دونوں کی پرانی دشمنی ہے۔''

''آخر جھگڑا کیا تھا؟'' صفدر نے ماں سے پوچھا ''کچھ تو بتاؤ''۔ ''یہ مجھے ٹھیک سے یاد ہے۔ تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ رخشی تو بہت بعد میں ہوئی۔ اس کے ابا کو تمہارے ابا نے غصے میں کہیں ''سی آئی ڈی کتا'' کہہ دیا تھا۔ اس وقت تک محلے والوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ نوجوانی میں بلگرامی، گوروں کے راج میں، پولیس کے خفیہ محکمے میں کام کرتے رہے ہیں۔ یہ بہت بری بات سمجھی جاتی تھی کوئی انگریزوں کے آگے اپنوں کی مخبری کرے!''۔

اب صفدر خاموش تھا اور اس کی ماں تاریخ بیان کر رہی تھی ''ملک غلام تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ جامع مسجد کے آس پاس ہر وقت ہی بھیڑ ہوتی ہے۔ اس شام بہت ہجوم تھا۔ دو گورے گزر رہے تھے۔ ہجوم نے چھیڑ چھاڑ کی۔ ان کی سائیکلیں چھین لیں۔ فوجی بھڑک اٹھے، نخوت کے مارے تھے۔ گالی گلوچ ہی نہیں ہاتھ پیر سے کام لینے لگے۔ پستول تان لیا۔ ہجوم نہتا تھا۔ تماشا سمجھ رہا تھا۔ پستول دیکھ کر ڈرنے کے بجائے بپھر گیا۔ یہ تو اللہ جانتا ہے کہ بھیڑ بھڑ کے میں کیا ہوا؟ دو تین اپنے بندے زخمی ہوئے۔ ایک گورا جان ہار گیا۔ پولیس کے آنے سے قبل زخمیوں کو ادھر ادھر کر دیا گیا۔ پولیس آئی، وہاں موجود مجمع سے کئی افراد کو پکڑ کر لے گئی۔ تمہارے ابا سے کسی نے کوئی تعرض نہ کیا۔ ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ کئی جاننے والے عزت کرنے والے موجود تھے۔ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ بلگرامی بھی وہاں ہوں گے۔ گرفتاریوں کے بعد مجمع چھٹ گیا۔ تمہارے ابا گھر آ گئے۔ اس زمانے میں لوگ حکومت مخالف جذبات کی وجہ سے کسی کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ الٹا ڈھال بن جاتے تھے۔ اسی لئے سی آئی ڈی میں کام کرنے

والوں سے سخت نفرت کی جاتی تھی کیونکہ وہ جھوٹی سچی رپورٹیں کر کے انگریزوں کے لئے قربانی کے بکرے پکڑتے تھے۔ ان میں سے اکثر کو داغا جاتا، عبرت کا نشان بنایا جاتا تھا۔ زیر زمین سرگرم جیالے بھی کوشش کرتے پولیس کے ہاتھ نہ آئیں''۔ غمگین صورت اماں نے دلگیر آواز میں کہا ''ایک روز پولیس آئی اور تمہارے ابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ کسی نے ''اوپر'' رپورٹ کی تھی کہ یہ گورے فوجی کے قتل میں ملوث ہیں۔ مزید کھوج کرنے پر معلوم ہوا بلگرامی نے رپورٹ میں لکھا ہے کہ مجمع کو اشتعال دلانے میں، مکرم بخاری آگے آگے تھے پھر پتہ چلا استعمال ہونے والا پستول گورے سے چھینا گیا تھا۔ پستول پر انگلیوں کے نشانات ہیں۔ مشتبہ اور مشکوک افراد کو پکڑ کر نشانات ملائے جا رہے ہیں تاکہ مقدمہ چلایا جا سکے۔ گرفتاری کے بعد قتل کے سنگین الزام سے بچنا محال تھا۔ کوئی آٹھ روز بعد تمہارے ابا گھر آ گئے کچھ پتہ نہیں اندر خانہ کیا ہوا؟ مجھے معلوم ہے، کچھ مدت بعد پڑوس میں دروازے پر خان بہادر زکریا بلگرامی کی نئی تختی لگ گئی۔ بیٹا! اس کے بعد سے تمہارے ابا خان بہادر سے دبنے لگے، ان کی شخصیت ہی بدل گئی۔ کاروبار ٹھپ کر کے اخبار میں پروف ریڈر بن گئے۔ تمہارے نانا کو وہ سب حالات معلوم تھے بڑی خوشی سے ان کے ساتھ میری شادی کر دی۔ یہ آزادی ملنے کے بہت عرصے بعد کی بات ہے۔ زندگی مشکل تھی۔ تنخواہ کم تھی۔ مجھے تنگی کی شکایت رہتی تھی۔ جب بہت زچ ہو گئے تب بتایا کہ انہوں نے انگریزوں کی قید کاٹی ہے ان پر قتل کا الزام لگا تھا۔ وہ زیادہ پیسوں والی نوکری کر سکتے ہیں۔ مگر اس نوکری میں انہیں ہمیشہ تحفظ حاصل رہا ہے۔ ان کا خیال ہے، اخبار کی وجہ سے پولیس ان پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتی ہے۔۔''

''اماں ہماری پیدائش سے پہلے، اتنے پرانے قصے کا مجھ سے یار خشی سے کیا تعلق ہے؟'' صفدر نے پوچھا۔

''ہے بیٹا! تعلق ہے۔ تم مکرم بخاری کے بیٹے ہو اور مکرم بخاری دشمن ٹھہرا۔ بلگرامی بارسوخ آدمی ہے جو انگریزوں کی حکومت سے خطاب یافتہ ہے۔ سب ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک

سلطنت ملی ہے، ملک آزاد ہوا ہے، پر بہت سوں کی ذہنیت نہیں بدلی۔ وہی غلامانہ سوچ ہے اتنے برسوں بعد بھی پرانی عادتیں اور رسمیں مسلط ہیں۔ دشمنیاں برقرار ہیں ہم ایک بے حد بوسیدہ نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ غربت ہوگی، پڑھنے کو فیس نہ ہوگی، کمائی کا ذریعہ نہ ہوگا تو محروم لوگوں میں تلخی تو پیدا ہوگی۔ تم خود دیکھ لو' خراب حالات کے نتیجے میں نئی نسل نکمی' نکھٹو اور گستاخ ہے۔ ایک سے ایک کڑی ملتی ہے، جب بے روزگاری ہوگی، سارا بوجھ باپ پر ہوگا تو فیصلے بھی وہی کرے گا ؟ شادی بیاہ کے آزادانہ فیصلے کرنے والے خودسر بچوں کا ناطقہ والدین سے پہلے محلے اور شہر والے بند کر دیتے ہیں''۔ صفدر کی اماں ڈھکے چھپے اسے نصیحت و فہمائش بھی کر رہی ہوگی۔ ''بدنامی لڑکی 'لڑکے کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ عورتیں تو قید ہی ہیں۔ تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی مرد غلبہ ہے۔ مردوں کا راج ہے۔ شادی سے پہلے باپ' شادی کے بعد شوہر کی چلتی ہے۔ مغرب کا آدمی چاند پر پیر رکھ آیا مگر ہمارے یہاں آج بھی قدامت پرستی اور جہالت موجود ہے۔ ٹھیک ہے تھوڑی تعلیم کی روشنی پھیلی ہے مگر فرقے بازی' ہٹ دھرمی اور انتہا پسندی میں اضافہ نہیں ہوا کیا؟ پورے سماج میں تشدد کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ اندر ہی اندر ایک سرد طبقاتی جنگ جاری ہے جہاں مفاد ٹکراتا ہے۔ گھیراؤ جلاؤ کا چکر چلتا ہے۔ فساد ہوتا ہے۔ خون بہتا ہے عوام مرتے ہیں۔ عوام ہی پکڑے جاتے ہیں۔ کبھی کوئی لیڈر پکڑا گیا؟'' سوال پوچھ کر صفدر کی اماں خاموش ہو گئیں۔

صفدر نے حیرت میں ڈوب کر نیا سوال کیا'' اماں! یہ سب کس نے تم میں بھر دیا؟ میں تو تمہیں سیدھا سادا سمجھتا تھا۔''

''میرے بیٹے! جنگ آزادی کے دیرینہ سپاہی جسے قوم نے غازی کا خطاب دیا تھا' وہ اپنے ہی ایک پڑوسی کے ہاتھوں گونگا اور عضو معطل اور معمولی تنخواہ دار اخباری پروف ریڈر بنا' سدا قلاش اور تنگ دست رہا' اس کے حالات تمہارے سامنے ہیں''۔ غازی مکرم بخاری کی بیوی

نے پہلے سے زیادہ گمبھیر آواز میں کہا ''زمانہ بڑا استاد ہے سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ مردہ رگوں میں بھی سرخ خون بھر دیتا ہے''۔

صفدر چپ رہا کیا جواب دیتا۔ کیا بولتا۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا 'یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟

ایک روز خان بہادر نے اچانک غازی مکرم بخاری کو بلایا تو صفدر ساتھ ہولیا۔ وہاں رخشی تھی۔ اس کی والدہ تھی۔ خان بہادر نے جتایا وہ صوبائی وزیر رہ چکے ہیں' پالیٹکس میں ہیں۔ انگریز کے وقت سے' ان کا اثر رسوخ ہے۔ ان کے نزدیک بیٹی کا باپ ہونا کمزوری نہیں۔ انہوں نے اچانک گرجتے ہوئے کہا ''مکرم بخاری! اونچے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ اوقات میں رہو تمہیں یہ جان میں نے بخشی ہے ورنہ کب کے پھانسی چڑھ چکے! ہوتے جب چاہوں' کیس کھلوا سکتا ہوں''۔

صفدر نے' توہین سے لہولہان ہو کر' غصے پر قابو پا کر پوچھا تھا ''آپ کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں؟ ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے اور کون سا کیس؟'' مغرور خان بہادر نے منہ پھیر لیا۔ بیٹی ان کی کمزوری تھی یا نہیں' وہاں حاضر تھی پیچ تاپ کھا رہی تھی۔ صفدر اور رخشی جان گئے' ان کی دوستی سے خان بہادر زکریا بلگرامی بے خبر تھے۔ اس شام وہ ان کو ساتھ دیکھ کر جل گئے تھے' چڑ گئے تھے۔ خان بہادر نے بظاہر کرٹسی دکھائی اور کار میں لفٹ دی تھی مگر ان کے اندر کا سویا ہوا آتش فشاں جی اٹھا تھا۔ اس میں لاوا ابل رہا تھا۔ بیٹی پر باہر نکلنے یا صفدر سے میل جول پر پابندیاں لگانے کے بعد بھی انہیں قرار نہ آیا تھا۔ خوف تھا لڑکی قابو سے نہ نکل جائے۔ یہ پیچ و تاب اسی شام کا شاخسانہ تھا ورنہ ان دونوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ آپس میں ملے بھی نہ تھے کہ خان بہادر آپے سے باہر ہوتے، اونچے خواب دیکھنے کا طعنہ دیتے۔ صفدر والوں نے رشتہ مانگنے کی گستاخی بھی نہیں کی تھی ابھی!۔ یہ خفگی، یہ بے بات کا جھگڑا کیا معنی؟ صفدر کے ابا نے بیٹے کو چپ کرایا اور تحمل سے بولے ''آپ بڑے ہیں میں معافی مانگ لوں گا مگر یہ تو بتایئے میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟'' پھر خان

بہادر بھڑک ہی اٹھے۔ ''تمہارا بیٹا ہماری بیٹی کو ورغلا رہا ہے'' انہوں نے بدزبانی کی انتہا کردی۔ بار بار کہتے'' قاتل کو پھانسی نہ لگوائی تو نام بدل دینا!''۔ آزادی سے پہلے کا پرانا حوالہ تھا۔ بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ انہوں نے مدتوں پہلے کے اپنے ایک جھوٹ کو پھر سے سچ بنا کر الزام دہرایا تھا۔ سب سے پہلے رخشی اٹھی، اس کی ممی گئی پھر صفدر بھی اپنے ابا کے ساتھ گھر آ گیا۔

صفدر کے دل و دماغ میں، اماں کی باتیں سن کر کچھ شبہ رہ گیا ہوگا تو خان بہادر کے دربار میں حاضری کے بعد مطلع صاف ہوگیا۔ اس پر واضح ہو چکا تھا' انگریز حکمرانوں کے درباری غلام ذہن خان بہادر کا رویہ جارحانہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ خود صفدر کا رویہ سراسر باغیانہ تھا لیکن اماں ابا کے سمجھانے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لینے کے بعد اسے' صفدر کو، اندازہ ہوگیا لاٹھی کس کے ہاتھ میں ہے؟ طاقت کا سرچشمہ کہاں ہے؟ وہ طاقت کے آگے نہیں' اپنی مجبوریوں کے آگے جھک گیا۔ اس نے جان لیا' رخشی سے ملن خوابوں میں ہی ممکن ہے!

ایک روز کرامت آیا وہ صفدر کا دوست' رازدار' ہم جماعت اور رخشی کا کزن تھا۔ رخشی نے کہلوایا تھا اس کے ابا کی دھمکی کا اثر نہ لیا جائے بلکہ وہ اور اس کی امی پشیمان ہیں۔ جس پر مکرم بخاری نے اپنی بیوی صفورا سے کہا۔ ''رخشی کو بہو بنانے کا خواب نہ دیکھنا! بیٹے صفدر کے لئے اپنے طبقے سے دلہن ڈھونڈ کر بیاہ کردو۔ بہو کی دو روٹیاں بھی پک جائیں گی۔ میں نئے اخبار میں زیادہ تنخواہ پر چلا جاؤں گا۔ آج نہیں تو کل' خان بہادر صفدر کو نشانہ بنائے گا یہ میں ہونے نہ دوں گا جنگ کے نتیجے میں ہار نظر آ رہی ہو تو لڑائی سے بچنا بہتر ہوتا ہے''۔

صفدر بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ اس کے لئے دنیا تنگ ہو چکی تھی۔ اس کا دل پریشان اور خیالات منتشر تھے۔ یہ جرم نہ تھا کہ وہ رخشی کو اور رخشی اسے چاہتی تھی ایسا انہوں نے کب سوچا تھا کہ بوتل میں بند جن نکل آئے گا۔ دونوں کے درمیان امیری غریبی کی لکیر کھینچ دی جائے گی۔ وہ آزاد پنچھیوں کی طرح کھلی فضاؤں میں اڑنے پھرنے سے روک دیئے جائیں گے۔ رخشی کے ابا

نے جال پھیلا دیا۔ افسانہ بنا دیا۔ جیون دوبھر کر دیا۔ دو متوالوں کو قید تنہائی اور حبس بے جا میں ڈال دیا۔ اسے اندازہ ہوا وہ اپنے ماں باپ سے بھی پیار کرتا ہے۔ ان کی قربانیاں اور تنگ دستی فراموش کرنا گناہ ہوگا مگر مشکل یہ تھی کہ اسے' اس کی نامکمل تعلیم اور ظاہری سفید پوشی دیکھ کر کوئی چپڑاسی/چوکیدار رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے مزدوری کرنی چاہی نہ ملی۔ لوگ سمجھتے مذاق کر رہا ہے۔ کم حیثیت ملازمت میں ٹکے گا نہیں۔ اوباش' بدمعاش' بے ایمان وہ تھا نہیں لہذا کالے دھندوں میں پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بوڑھے ابا کی ملازمت سے دال روٹی چل رہی تھی۔ کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ ذمہ داری نہ تھی پھر بھی' گھر' آشیانہ اس طرح تو نہیں بنتا؟ جہاں لب ہلانا منع ہو۔ قانون کو اندھا کر کے پہرے بٹھا دیئے ہوں۔ رخشی بغاوت کر کے اس کے پاس آتو جاتی' صفدر اس سے شادی کر تو لیتا مگر نئے اور بہت سے مسائل کا پنڈورا بوکس کھل جاتا۔ ایک غریب گھرانے پر مظالم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ صفدر رسوا ہو جاتا۔

صفدر رسوا تو نہ ہوا، بے گھر ہو گیا!

وہ ایک ایسے شخص کا پاسپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو انگلستان سے وطن آکر فوت ہو گیا تھا۔ اس نے جھوٹ سچ بول کر ابا کے اخباری ادارے سے بطور قرض ایک معقول رقم منگوائی' جعلسازی میں ماہر کاریگر سے پاسپورٹ کی تصویر بدلوائی اور جہاز میں بیٹھ کر انگلستان قسمت آزمانے چلا آیا۔ پہلے دو سال قدم جمانے میں لگ گئے اسکے بعد کسی نہ کسی طرح نیا پاسپورٹ بنوایا اور نڈر ہو کر رہنے لگا۔ ابا لکھتے بہت اچھا رشتہ ہے آجاؤ ورنہ فون پر نکاح کر کے دلہن بلوا لو۔ وہ ٹالتا رہا اس پھندے سے بچنے کے لئے وہ گھر نہیں گیا۔ رخشی یاد آتی' دل مسوس لیتا۔ کئی سال بیت گئے۔ کرامت کے خطوط سے معلوم ہوتا' رخشی ماسٹرز کر رہی ہے اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ باقی خیریت ہے۔

اماں ہر چٹھی میں لکھوا رہی تھیں' جی چاہتا ہو وہیں شادی کر لو۔ ہمیں اعتراض نہیں۔

اس کارن ہم سے نہ ملو یہ منظور نہیں۔ ہم ترس رہے ہیں۔ اس نے کرامت کو لکھا۔ دس سال بڑی مدت ہوتی ہے وہ وطن آنا چاہتا ہے کرامت نے جواب دینے میں بڑا وقت لیا اس کا خط کیا تھا؟ چھٹا دھما کہ تھا۔ ''میرے دوست نہ آؤ۔ یہاں کوئی انقلاب نہیں آیا وہی پرانی ڈگر ہے تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ سنو گے، صدمہ پہنچے گا۔ میں تمہارا راز دار تھا' اب تمہیں اپنا راز دار بناتا ہوں۔ رخشی اور میری زبردستی شادی کردی گئی۔ اس پر ہم دونوں ہی ناخوش تھے۔ ایک روز رخشی نے تمہارا نام لئے بغیر کہا ''آپ سب کچھ جانتے ہیں''۔ میں نے کہا ''ہاں میں صفدر کا ہمدم اور ہمراز تھا''۔ رخشی کی آنکھیں بھیگ گئیں یوں ہمارے درمیان مفاہمت ہوگئی۔ ایک بچی ہوئی دو سال زندہ رہی اس کی ناگہانی موت نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کردیا اب ماشاءاللہ ایک بیٹا ہے یقین کرنا ہم دونوں تمہیں یاد کرتے ہیں۔ یار! تم نہ آؤ۔۔۔ آؤ گے' ملے نہ ملے ہم شرمندہ ہوں گے۔ کیا خبر زخم کھل جائیں' رسنے لگیں۔''

کرامت کی سادگی اور صاف گوئی نے صفدر کے زخم چھیل کران پر پھاہا رکھ دیا!

پھر' پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر گیا وہ سوچتا اب وہاں اپنا کون ہے؟ کیا معلوم بزرگ کہاں دفن ہیں؟ قبریں ہیں یا مٹ گئیں؟ بے وطن ہوئے بیس سال ہوگئے کوئی انقلاب نہیں آیا۔ آپا دھاپی ہے۔ حالات بگڑے ہیں۔ کرپشن بڑھی ہے پھر بھی' پھر بھی صفدر کے دل میں لگن تھی، ایک ساگاہٹ بے چین رکھتی تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ وطن جائے گا کچھ تو نیا ہوگا۔ صفدر اٹھا، کپڑے پہنے' کنگھی کی۔ ٹریول ایجنٹ کے یہاں گیا اور سیٹ بک کرآیا۔

وطن اپنا شہر اپنا تھا! پھر بھی وہ تنہا تھا' اکیلا تھا۔ وہی گلیاں محلے' وہی مکین و مکان پر اسے پہچاننے والا کوئی، نہ وہ کسی کو پہچان رہا تھا۔ رخشی کے بھی ابا فوت ہوگئے تھے۔ امی بیٹی کے پاس چلی گئی تھیں۔ خاندان وہاں سے جانے کہاں منتقل ہو چکا تھا۔ کرامت کے گھر والے بھی کسی دوسرے شہر میں چلے گئے تھے۔ صبح کا نکلا پردیسی شام کو بے نیل و مرام ہوٹل واپس آجاتا۔ تھکن صدا بن بن

جاتی ''رخشی تم کہاں ہو؟ کہاں ہو؟'' جتنا تھپک تھپک کر یادوں کو سلایا تھا اسی شدت سے کسک اٹھ اٹھ کر بے قرار و پریشان کر رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر بھی وہ پیاسا تھا۔ اپنے ہی جنم گھر میں در بدری نے دل پاش پاش کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس جائے گا۔ جہاں سے آیا ہے وہی اس کا ٹھکانہ ہے۔ اب وہی اپنا وطن ہے۔ وہ صبح اٹھ کر سیٹ بک کرانے جائے گا!

مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں معجزہ ہو گیا۔ ائیر لائن کے دفتر میں وہ مل گئی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی۔ شمشماد قد' خوبصورتی میں وقار اوڑھے' ساڑھی میں لپٹی رخشی ایک طرف کھڑی اسے پہچان رہی تھی اس کی آنکھوں کا کالا جادو ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر' ساکت ہو کر یکدم ہلچل مچاتی بے چینی کو سکون میں لپیٹ کر' بظاہر خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تبھی رخشی اعتماد سے' بردباری سے چلتے ہوئے' دیرینہ ہمدم' پرانے دوست کے پاس آئی۔ ایک سریلی آواز صفدر کے کانوں سے ٹکرائی ''یہ تم ہی ہونا صفدر؟''۔

لمبی جدائی کی دھوپ میں جھلسے ہوئے صفدر پر ایسی برکھا ہوئی کہ جل تھل ہو گیا۔

اتنے میں ایک نوجوان ان کے پاس آیا رخشی تعارف کرانے لگی۔ ''یہ شیراز ہے'' نوجوان نے روک دیا'' آپ انکل صفدر ہیں نا! میں ہوں شیراز بن کرامت۔ آپ کے دوست نہیں رہے''۔ صفدر کو دھکا لگا دکھ ہوا۔ شیراز نے سنبھالا'' ڈیڈ آپ کے راز دار تھے۔ میں شروع سے مم اور ڈیڈ کا راز دار رہا ہوں اور مجھے آپ کی ساری نٹ کھٹیاں معلوم ہیں۔ مجھے بھی آپ اپنا دوست' اپنا ہمراز و ہمدم سمجھیں''۔ نوجوان شیراز کسی پختہ عمر کی طرح بولتا جا رہا تھا جیسے بہت خوش ہو' ہاں میں اس خوبصورت کرشماتی اتفاق پر'' ایکسائٹ'' ہو رہا ہوں'' شیراز نے کہا تھا۔

اداسی کوسوں دور بھاگ گئی اکٹھے چائے پی گئی شیراز بڑا چلبلا تھا۔ شریر اور نٹ کھٹ پر دیکھنے میں اس کا حلیہ جدید اسلام پرستوں کا سا تھا۔ رخصت کے وقت' گلے ملتے ہوئے صفدر کے کان میں بولا'' انکل! جب دل چاہے امریکہ آ جایئے گا۔ میں اس خوبصورت خاتون کو آپ کے

نکاح میں دے دوں گا۔"

شیراز نے امریکہ میں تعلیم مکمل کی۔ وہیں بہت اچھی جاب مل گئی تھی اور اب وہ اپنی امی کو لے کر امریکہ جا رہا تھا۔

ماں بیٹا امریکہ آباد ہونے چلے گئے۔

صفدر انگلستان آ گیا۔

وہ ہر لمحہ امریکہ سے فون کا منتظر رہتا پھر اپنے دل کو تسلیاں دیتا۔ شیراز کی نئی نئی ملازمت ہے۔ رخشی پہلی بار وطن سے نکلی ہے وہ مصروف ہوں گے ذرا ٹک تو جائیں صفدر کوٹ کی اوپر والی جیب میں انگلیوں سے شیراز کا کارڈ محسوس کرتا اور فون کرنے سے رک رک جاتا۔ کئی ہفتے، کئی مہینے گزر گئے۔ اس میں فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی وقت، آج کل آج کل کرتے بیت رہا تھا۔

یوں وقت نہیں گزرا، ایک قہر تھا، اچانک ٹوٹ پڑا۔ قیامت گزر گئی۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ ہوا اور تباہی و بربادی کی نئی تاریخ رقم ہو گئی۔ پلک جھپکتے، ہزاروں افراد موت کی گہری نیند سو گئے۔ صفدر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ شیراز کا دفتر بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں تھا۔ جیب سے شیراز کا کارڈ نکال کر دیکھے بغیر اسے یاد آ گیا۔

وہ شیراز اور رخشی کی تلاش میں جت گیا۔ ہیلپ لائن، اخبار، ٹی وی، انٹرنیٹ پاکستانی سفارت خانہ امریکی دفاتر ہر جگہ رابطہ کیا، بجز ناکامی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مرجانے والوں کی لمبی فہرستیں، مجبور و مغموم لواحقین، بچ جانے والی زندہ لاشیں اور زخمی سب کے کوائف دستیاب تھے مگر شیراز اور رخشی لاپتہ تھے۔ ان کا نشان تک نہ دکھائی دیا۔ وہ نہ ملے جن کی صفدر کو تلاش تھی۔ زندوں یا مردوں کسی کی فہرست میں ماں بیٹے کا نام نہیں ملا۔ انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔

وہ بے نشان ہو چکے تھے۔ صفدر کس در پر دستک دے؟ کہاں جھانکے؟ کونسا ملبہ کھنگالے؟ کیا کرے؟ سوال ہی سوال تھے۔

جب دیکھوٹی وی پر بش کی صورت اور کانوں میں اس کی آواز پڑتی۔ دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کا زخم خوردہ صدر غضبناک لہجے میں نئی قسم کی جنگ اور انتقامی حربوں کی بات کرتا نظر آتا۔ ایک دنیا سہم کر' عقابی پروں تلے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ افغانستان پر حملے میں دوست دشمن سب شریک تھے۔ شکست خوردہ روس' امریکہ کا دشمن روس بھی متفق تھا۔ دونوں طاقتوں کے سربراہ سی آئی اے (CIA) اور کے جی بی (KGB) کے ''گھرانوں'' سے تھے۔

گھر بیٹھے بیٹھے صفدر کے نتھنوں میں بارود اور خون کی بو بس گئی تھی۔ سوتے جاگتے اس کی آنکھوں کے سامنے لاشیں تھیں۔ تباہ و برباد ورلڈ ٹریڈ سنٹر ہو یا کھنڈر میدان ہر جگہ رنگ' نسل اور عقیدے سے بے نیاز لاشے مٹی چاہتے تھے۔ موت کا کوئی روپ ہو' تابوت' پھول' پرچم اور مناجاتیں یا خاک میں لتھڑے ہوئے جسموں پر برستی ٹھوکریں! انسانیت روتی' گرلاتی اور بین کرتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لئے دیکھنے' تلاشنے کو اور کیا رہ گیا تھا؟ کچھ نہیں! نڈھال صفدر ہار کر چکنا چور ہو کر انٹرنیٹ سے ہٹنا چاہتا تھا۔ لیکن ڈھے گیا۔ دوسری پل وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا اور اوپر کی منزل میں اپنے بستر پر جا گرا۔ اتنی سکت نہ تھی کہ لباس تبدیل کرتا۔ بستر میں لیٹ کر پردہ سرکا کر، کھڑکی سے جھانکتے ہوئے خلاؤں، میں گھورنے لگا اب وہ گمشدوں کو آسمانوں میں ڈھونڈے گا؟ وہ پائینتی سے سرہانے کی طرف لڑھکا۔ مدھم شبناک روشنی میں سیب کا درخت' ناشپاتی کا درخت' پتوں بھرے' پتوں میں ڈھکے پودے اور درخت ہی درخت! اس کی نظر دھندلا، دھندلا گئی۔ آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ سامنے ایک نہیں کئی، بہت سی تصویریں تھیں۔ پتہ پتہ تصویر تھا کوئی ایک تصویر نہ تھی معصوم' مغموم اور ملول چہرے تھے! چہرے ہی چہرے!!

وہ بھی اپنوں کے چہرے تھے!!!

طرزِ تغافل نہ عرضِ تمنا

ڈاکٹر امروز کمال کو لگا' انگریزی عبارت کو وہ اردو سمجھ کر پڑھ رہی ہے! خیال تو نمو ہے' طلوع ہے' جنم ہے۔ اس کی زبان وہی جو من بھاوے! امروز نے سر جھٹک کر آنکھیں مچکاتے لفظوں پر نظریں گاڑ دیں۔

''اب میرا سانس جلتا ہے نہ دل بے قابو ہو کر تیز تیز دھڑکتا ہے مگر میں تمہیں یاد کرتا ہوں۔ کیا تم مجھے بھول گئی ہو؟ خدا نہ کرے ایسا ہو! گمان تھا درد فراق سہہ لوں گا۔ تمہیں خوش دیکھ کر جی لوں گا مگر ایسا تو نہیں ہے۔ ایک بار تمہاری گلی میں' ایک کسک لیے آیا تھا۔ یہ سوچ کر کوئی گھر میں خالی کب بیٹھتا ہے؟ کچھ نہ کچھ مشغولیت ہوتی ہے۔ آرام ہی سہی' مداخلت اچھی نہیں لگتی۔ کیسے دستک دیتا؟ کوئی بہانہ ہوتا' پوچھ سکتا کیسی ہو؟ زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تم نے؟ کاش پوچھ لیتا! بنا بتائے' خبر کیے بغیر ہی لوٹ آیا۔

رات آئے گی' کٹ جائے گی۔ چاہوں گا پر سانس کی ڈوری نہیں کٹے گی۔ صبح ہوگی۔ اندھیرے سے روشنی پھوٹے گی دیکھوں گا ہر طرف اجالا ہے۔ فضا میں پھولوں کی نامعلوم سی تازہ مہک ہے اور چڑیوں کی چہکار ہے۔ رونق ہے۔ میں چپ' خاموش' کارِ جہاں میں گم رہتا ہوں۔ سرگوشیاں ہیں کہ اندر ہی اندر پھنکارتی ہیں' تم نہیں ہو، تم نہیں ہو۔ جینا' مجھ پر بوجھ ہے۔ تاسف و محرومی کا بھاری پتھر سینے پر لیے شام کر دیتا ہوں۔ شب و روز کے اس معمول میں چاند جب نکلتا ہے' کوئی فرحت نہیں ملتی۔ باقی جدھر دیکھتا ہوں سراب ہے۔ پیاس ہے۔ ان بجھ تشنگی کچل رہی ہے۔ جاناں! اور تم سے' کیا کہوں؟

یہ جان کر بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا' تم بے قرار ہو یا سکون و شادمانی کی ست رنگی پینگ میں جھول رہی ہو، میرے لیے تم' دسترس سے باہر' ایک سایہ ہو۔ ضرور! جگنو تمہاری مٹھی میں

اور ستاروں بھری مانگ، تمہاری دلکشی بڑھا رہی ہوگی۔ میں بے خبر نہیں جانتا، نہیں جانتا! صرف اسی ایک سچائی سے واقف ہوں کہ تمہارا سکھ تمہارا ہے اور تمہیں نہ پانے کا دکھ سراسر میرا ہے۔ کوئی شک نہیں، اس حقیقت کا ادراک رکھتا ہوں کہ میں قیس نہیں ہوں۔ آج کا انسان ہوں جو محرومیوں کو محرومیاں سمجھ کر کڑھتا ہے۔ کوئی آڑ نہیں لیتا' کوئی سا دوسرا نام نہیں دیتا۔ عذر نہیں دھرتا۔ جسے تقدیر نے' سماج نے ہرا دیا ہے۔ بے بس کر دیا ہے۔ میں ہارا' کچوکے کھاتا' جلتا' کڑھتا ہوں۔۔۔ کسی تبدیلی کی امید نہیں' سمے کا سچ' میرے سامنے ہے۔ صداقت لباس یا لبادے میں نہیں سامنے عریاں ہوتی ہے۔ تم سماجی مرتبوں کی حقیقت سے واقف ہوگی' پوچھ سکتی ہو یہ سب اٹل ہے تو میری گلی میں کیوں آیا تھا؟ پوچھو تو کیوں آیا تھا؟ اپنے ہونے کا احساس دلانا' احتجاج خاموش سہی۔۔۔ میرا حق ہے!''

ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ ڈاکٹر امروز کمال نے خط مروڑ کر ردی کی ٹوکری کی طرف اچھالا۔ نشانہ خطا گیا۔ محبت نامہ ٹوکری کے باہر گر کر زمین پر لڑھک گیا۔ وہ اٹھی۔ پریم پتر زمین سے اٹھا کر دور پھینکنا چاہا پر رک گئی' واپس پُفی پر بیٹھ کر' دوبارہ پڑھا۔ شاید اداس بھی ہوئی' پلکیں بھی بھیگی ہوں گی۔ کچھ سوچ کر کونے میں پڑے اسٹینڈ پر رکھی استری کو ہلکا سا گرم کیا' خط کو الٹا کر کے رکھا' شکنیں نکال کر اصل حالت بحال کی اور کہیں سے تحفے میں ملے جیولری بکس میں دوبارہ سینت سنبھال دیا۔ یہ اس کے نام یوسف بے زر کا آخری خط تھا۔

امروز کمال نے سوچ کی ان پرتی رو تلے دب اور ڈوب کر ابھرتے ہوئے خط کو نکالا' اس کی تاریخ دیکھی۔ اتنا پرانا نہیں تھا اور زخم بھی بھرا نہیں تھا۔ وہ سچ مچ اداس ہوگئی۔ پورا کمرہ ہی نہیں اس کے گھر کا کونہ کونہ ہم نفسی کا حق ادا کرتے ہوئے بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ اونچ نیچ' سماجی مرتبے' خودساختہ قدریں' سوچ سمندر میں غرق مگر ایک فرق تھا۔ اسی فرق کی دیوار یوسف کی چچی نے کھڑی کر دی تھی۔

باہر شام ڈھل رہی تھی۔ گیت گاتے پرندے آشیانوں کو واپس جا رہے تھے۔ اس کے گھر کے مقابل گھروں کے پیچھے، پارک میں فٹ بال کھیلتے ہوئے بچوں کی بلند آوازیں ناپسندیدہ شور بن کر اس کے کانوں سے مس ہو رہی تھیں۔ پڑوس کے ٹی وی پر ٹاپ آف پوپ کی موسیقی چیخوں میں ڈھل کر پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ صبح ٹی وی کی خبروں اور اخبار کے مطابق ویسٹ یارکشائر میں بارش کا امکان تھا۔

امروز نے باہر جھانکا، کھڑکیوں کے شیشے اور لان کی گھاس خشک تھی۔

ڈاکٹر امروز کمال خیالی غوطے سے باہر آ گئی۔

شادی میں تین دن رہ گئے ہیں! تمام ضروری امور انجام دینے کے بجائے، وہ الکلے کے اس کشادہ ڈیٹیچڈ گھر میں اکیلی بیٹھی، یادوں کے کچے گھڑے پر چناب میں ''ٹھل'' رہی ہے! وہ ہنسی، رہائش یارکشائر کی، تمثیل پنجاب کی! اس نے اپنے آپ کو سمیٹا۔ پہلے شادی کا جوڑا لانا ہے۔ آج لیٹ کلوزنگ ہے۔ آٹھ بجے رات تک بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے کے بعد ہی پیکنگ شروع کرے گی۔ پل پل کر کے تین دنوں کا وقفہ شوں شاں، لپک جھپک گزر جائے گا۔ نکاح، رجسٹریشن، ریسپشن، ہلٹن میں شب عروسی، علی الصبح ہنی مون پر پیرس روانگی۔ اس نے گھڑی دیکھی آدھے گھنٹے میں اوسکر (اصغر) کو فون کر کے ملاقات کا وقت طے کرنا ہے۔ امروز منہ پر چھپکا ڈالنے کے لیے جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔

نیشنل ہیلتھ کے ایک بڑے مشہور و ممتاز ریجنل ڈائریکٹر، اصغر طور نے، جن کو سب اوسکر پکارتے تھے، شہر کی ایک مشترک جنرل پریکٹس میں شریک خاتون ڈاکٹر امروز کمال کو اپنے لیے چن کر سبھوں کو حیران ہی نہیں پریشان بھی کر دیا تھا۔ ملنے والوں کو جستجو تھی، کیا دونوں کی پہلی شادی ہے؟

اصغر طور نے، فون پر دوبار ٹوکا۔ ان کی گفتگو قطعی بے ربط ہو رہی تھی چنانچہ تشویش میں

مبتلا ہو کر پوچھا ''امروز تمہارا دھیان کدھر ہے؟'' اس نے لمحہ بھر کو فون منہ سے پرے کر کے اپنے حواس جمع کیے۔ پھر بھی اس کی سسکی سن لی گئی۔ ''کیا رو رہی ہو؟'' وہ پریشان ہو گیا۔ ''تقریباً رو رہی ہوں'' امروز نے سسکی نگل لی ''کیا ہمیں واقعی اس عذاب سے گزرنا ہوگا''۔ اصغر حیران رہ گیا ''تم اسے عذاب کہہ رہی ہو؟ ہماری زندگی کے سب سے زیادہ سہانے موڑ کو بدعا دے رہی ہو! یہ آغاز ہماری جنت کا پہلا باب ہوگا۔ یقین مانو میں وعدے نبھاؤں گا۔ تم خوش، بہت خوش رہو گی'' وہ مسلسل بول رہا تھا ''یاد ہے ہم نے کیا کیا سوچ رکھا ہے؟''۔ اصغر نے دھیمے سے تسلی دیتے ہوئے یاد دلایا ''ویڈنگ ریسپشن پر ڈھول اور شہنائی بجے گی۔ طے ہے مہمانوں کے ساتھ بھنگڑا بھی ڈالیں گے۔ یہ نصف صدی پہلے کا منظر نہیں جب سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر قسم کے اونچے لوگ انگلستان آتے اور لفظ پھول کھلاتے تھے۔ اب عام لوگ بھی یہاں خاصی تعداد میں آ بسے ہیں۔ بڑی حد تک ماحول و آداب بدل گئے ہیں۔ تب انڈین اپر کلاس انگریزوں کے ساتھ فاکس ٹراٹ (رقص) کرتی تھی۔ اب محنت کشوں کی اولاد یونیورسٹیوں میں ہم عمروں کے سنگ جدید تیز رقص کرنے کے علاوہ برابر کے مواقع طلب کرتی ہے۔ اس سے زیادہ۔۔۔ پھر نیما آئے گی۔ اسے ہم لڑکا بنا کر رکھیں گے۔ دونوں چاؤ اکٹھے پورے کر لیں گے۔ بلے بلے ہوگی'' امروز کھکھلا پڑی اور مان گئی شاپنگ سے سیدے ڈرائیو کر کے سلون اسکوائر ''گول گپے کھانے جائیں گے''۔

وہ بڑے شوق سے سلون اسکوائر گول گپے کھانے جائیں گے! کیا وطن بھی جا کر کبھی گول گپے کھائیں گے؟ دونوں کھانے پینے کے شوقین تھے اور دونوں کو ساحل پر ناریل کا پانی پینے کی بھی بڑی لگن تھی۔ یہ زبانی شوقییاں تھیں۔ وہ کبھی وطن نہیں گئے تھے۔ ہنی مون پیرس منانے کے لیے جا رہے تھے اور پہلے کبھی ہالیڈے کے لیے گئے، یورپ کے ہی کسی شہر میں گئے۔

اصغر اور امروز اپنی اٹھان یہاں ہونے کے کارن رنگ اور نسل کی بنیاد پر، کسی سے امتیاز نہیں برتتے تھے تاہم وہ رنگدار شہریوں کے لیے اکثریتی فرقے کے نسل پرستوں کی نظروں میں

چھپی حقارت سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ اس کے باوجود ان کا رہن سہن بزرگوں کے لاتبدیل ورثہ کی طرح تھا۔ظاہر ہے' کپلنگ کا مقولہ دفن' اب مشرق' خالص مشرق نہیں' وہاں برگر کلچر پھیل رہا ہے اور مغرب میں شلوار قمیض اور ساڑھی کے ساتھ مغل کری اکثر کو قبول و مرغوب ہے۔ جب گول گپے دو سومیل پر مل جائیں تو ہزاروں میل کا سفر کون کرے؟ اس وقت وہ خوش تھے۔ ماحول مسکرا رہا تھا۔ اوسکر زیادہ ہی موڈ میں تھا۔ یہ قصہ وہ کئی بار سنا چکا تھا کہ اس کے ابا ایک کرنل ویکفیلڈ کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایک روز ایسی کایا پلٹ ہو گی۔ اسی کرنل کی بیٹی جین' ان کے گھر میں' کلیننگ کے لیے آیا کرے گی۔ یہ منحنی سی' ناتوان سی سفید فام لڑکی اور کہاں اس کا نہایت دبدبے والا انگریز باپ کرنل رچرڈ ویکفیلڈ! امروز نے کہا ''یہاں کام میں عار نہیں۔ یہ ملک انگریزوں کا ہے' وہی سب کام کریں گے۔ ہمارے یہاں بھی جھاڑ پونچھ اور واشنگ کی خادمہ کے علاوہ بیرونی کھڑکیاں دروازے صاف اور باغبانی کرنے انگریز ہی آتے ہیں''۔ اس پر اوسکر نے کہا تھا'' یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا تم اس تسکین و مسرت کا اندازہ کرسکتی ہو جو ابا کو انگریزوں پر حکم چلانے سے ملتی تھی؟''۔ امروز کا کہنا تھا'' وہ بڑا مختلف دور تھا۔ اب ہم اپنا تشخص قائم رکھتے ہوئے' میرٹ کے برتے پر آگے بڑھ کر نسلی تعصب کم کر سکتے ہیں''۔

بات کا رخ بدل گیا تھا۔ امروز اور اصغر مسرور تھے۔ امروز کی ذرا پہلے کی ہیجانی گفتگو نے اوسکر کو تحیر و تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔

تجسس' تحیر یا تعجب کیسا؟ اچانک نہیں' سبھی کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ امروز کو یاد ہوتا کہ وہ ایک طرف رکھے' تقریباً فراموش کردہ چھوٹے سے جیولری بوکس کو بن چاہے' بلاضرورت' دفعتاً ہاتھ کیا لگا بیٹھے گی' بکھیڑے میں پڑ جائے گی تو ہرگز سنگھار میز کو ٹٹولتی نہ پھرولتی! اسے کیا خبر تھی ایک دیرینہ اتحاف' ایک پرانی سوغات کے افعی سے خود کو ڈسوا کر نیلی پڑ جائے گی ۔۔۔ یہ نہ ہو گا یوسف کا محبت نامہ مروڑ کر' دور پھینک کر یا ضائع کر کے نچنت ہو جائے! الٹا'

وہ نامہ محبت دل کے گلاب میں خار بن کر چبھے گا' لہو رسے گا!!

یوسف نامے کی انگریزی عبارت کا ایک ایک حرف حتیٰ کہ ایک دو لفظوں کے غلط ہجے' اس کی نگاہوں میں کھب کر' اس کے جذبات کو اتھل پتھل کر رہے تھے۔

ڈاکٹر امروز کمال نے ملے جلے مبہم و مبین و مبہوت جذبوں میں غلطاں ہو کر ادھر ادھر کریدا۔ باقیماندہ شادی کارڈوں میں سے ایک پر یوسف بے زر' ووڈز لینڈ آف سٹی روڈ لکھا اور پرس میں رکھ لیا۔ اتنے شارٹ نوٹس پر کارڈ معذرت کے ساتھ دستی پہنچا کر وہ (اپنے) یوسف کو بھی مدعو کرے گی۔ اپنی اور اس کی بے رنگ کہانی کو نیا عنوان دے گی۔ لذت قرب نہ سہی' ہجر کی اذیت سہی! ان دونوں کیفیتوں سے ہمکنار ڈاکٹر امروز کمال چاہتی تھی ذرا یوسف بھی تو ہجر و وصال سے ماوٗرا اشقاوتوں کی شوریدگیوں کا مزہ چکھے!

ایک فکر دامنگیر تھی کیا یوسف پرانے پتہ پر رہتا بھی ہے؟ مل گیا تب ان کی مڈبھیڑ کیا روپ بھرے گی؟

اس نے' ڈاکٹر امروز کمال نے دل ہی دل میں گنتی کی۔ ایک سے دوسرے ہاتھ تک نوبت نہ پہنچی۔ وچھوڑے (جدائی' ہجر) کے بیتے سال گنے گئے۔ وہ جیسے ڈھے گئی! کتنی جلدی سب کچھ بدل گیا؟

سردی تھی۔ وہ مینگھم میں وزٹ پر نکلی تھی۔ مل ورکرز کی اس گلی میں سناٹا تھا۔ بچے اسکولوں میں اور ان کے ڈیڈی ڈے شفٹ پر جا چکے تھے اکثر مرد نائٹ کر کے آئے اور خواب غفلت میں تھے۔ ڈاکٹر امروز' ایک مریضہ جس کا شوہر کام پر اور پاس انگریزی اردو سے ناواقف ساس موجود تھی' اس کو دیکھ کر نکلی تو اس کی کار کا پچھلا ٹائر فلیٹ تھا۔ وہ باوجود کوشش پہیے کے پیچ ڈھیلے کرنے اور پہیہ اتارنے میں ناکام رہی۔ بڑی شش و پنج میں تھی۔ اس نے اے اے (AA) والوں کو بلانے کے لیے موبائل ڈائل کیا تو موبائل کی بیٹری ختم تھی۔ اس گلی میں کوئی ٹیلی فون بوتھ

بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیا کرے' کیا نہ کرے؟

شاید کسی نے اسے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ لیا تھا۔ سامنے والی قطار کے ایک گھر سے کوئی سلیپنگ سوٹ اور سلیپر پہنے، اوپر اوورکوٹ ڈالے لرزیدہ لرزیدہ آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے پہیّے اسکرو وکھولے' ٹائر بدلا مگر اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ واپس جاتے ہوئے آدھے راستے میں گر گیا۔ ڈاکٹر نے لپک کر مدد دی۔ گھر پہنچایا۔ وہ سخت بخار کی حالت میں تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔ فرنٹ روم ہی اس کا رہائشی کمرہ تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد جب وہ کسی قدر قابو میں آ گیا تب کہا ''گھر میں کوئی نہیں ہے۔ سب وطن گئے ہوئے ہیں''۔

وہاں کوئی کیا؟ کچھ بھی نہ تھا۔ کونے کی میز پر ٹی میکر تھا۔ دودھ کی بوتل خالی پڑی تھی۔ ہیٹنگ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہیٹر خراب ہوگا۔ کونے میں اوندھا پڑا تھا۔ ہاٹ واٹر باٹل سرے سے موجود نہ تھی۔ امروز نے جوں توں کیتل کا پانی گرم کر کے نوجوان کو بستر میں بیٹھنے کے لیے کہا اور ڈسٹر میں لپٹی گرم گرم کیتل تھمادی۔ کپکپاتے ہوئے کئی روز کے بیمار کا دم میں دم آیا۔ بولا ''ناحق تکلیف کرتے ہیں آپ، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ معمولی فلو ہے''۔ امروز خاموشی سے باہر گئی اور کار سے پیراسیٹامل لے آئی۔ مریض کو دو گولیاں کھلا کر کہا کہ وہ ابھی واپس آتی ہے پھر قریبی کیمسٹ سے دوا اور ہاٹ واٹر باٹل لائی۔ ایک دکان سے دودھ اور سیریئل وغیرہ بھی لے لیا۔۔۔

یہ تھی ان دونوں کی پہلی ملاقات۔ ڈاکٹر امروز کمال اور یوسف بے زر کی اولین ملاقات!

اپنے تعارف میں یوسف نے کہا تھا ''میں سناروں کے خاندان سے ہوں۔ سونا چاندی کے نام سے وائٹ ہل پر جیولری کا نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ چچا چچی سے ایک کمرہ لے کر رہ رہا ہوں۔ میرے گھر والے اپنے نام کے ساتھ زرگر لکھتے ہیں۔ میں شروع سے ان سے مختلف طبع ہوں۔ اسکول کے زمانے سے یوسف بے زر! اس پر امروز بے ساختہ بولی ''ایک دن بے زری' زرگری میں بدل جائے گی'' پھر گرہ لگائی ''تب اس نام میں بھی کمال کی تمکنت ہوگی!''۔

سادہ سی، اتفاقی ملاقات بے وجہ بڑھتی چلی گئی۔ گوشئہ یوسف بے سروسامان تھا۔ خزاں زدہ اور ویران! گڈمڈ، ابھی ابھی سرد سرد کمرے میں بوسے کی سی گرمی آگئی تھی۔ آتو گئی تھی مگر تھوڑی سی دیر کے لیے! ایک روز اچانک آندھی کی طرح یوسف کی چچی چچا اطلاع کیے بغیر پہنچ گئے۔ وہ سال چھ مہینے کے لیے گئے تھے۔ چند ہفتوں بعد ہی پلٹ آئے! یوسف اور امروز چائے پی رہے تھے۔ باہر انگلستان ہوگا، یہاں اکیلے کمرے میں دو ایشیائی۔۔۔ ایک مرد، دوسری عورت۔۔۔ تہمت کے لیے اور کیا جواز چاہیے؟ دوسروں پر شک اور بداعتمادی کی گٹھڑی، بعض لوگ ہمراہ لاتے ہیں! ان ہونی یہ ہوئی کہ چچا چچی کے گھر میں گھسنے سے پہلے ہی پڑوسن نے بلا کر کان بھر دیئے تھے۔ چچی دروازے پر کھڑے ہو کر مردانہ وار چیخنے چلانے لگی کہ ایک ڈاگڈرانی ان کے معصوم بھتیجے کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ آس پاس سے کئی لوگ آگئے۔ ایک تماشا کھڑا ہوگیا۔ بڑی بدمزگی ہوئی۔

یوسف اور امروز کے درمیان، ش جھن، ش جھن کر کے ایک سمندر آگیا!

امروز نے بعجلت پریکٹس بدلی۔ بھرم رکھنے کے لیے ادھر کا رخ پھر کبھی نہ کیا۔ یوسف کی چچی کی جہالت پر ناگواری اور غصہ یہ سوچ کر تھوک دیا، اس میں یوسف کا کیا قصور؟۔ دھماکے، تماشے سے پہلے، ابتدائی میل جول تھا جس کی یاد سی رہ گئی ہے۔

امروز کو یوسف کے محلے میں دو ایک مریض وزٹ کرنا تھے۔ فراغت جلد پانے پر اس نے سوچا یوسف کو بھی دیکھتی چلے۔ یوسف کو چارپائی سے اٹھے چند ہی روز ہوئے تھے۔ وہ تیار ہو کر نکلنے لگا تھا، رک گیا۔ عجب چھب تھی۔ امروز دھک سے ہوگئی۔ یہ شخص جو تین چار روز پہلے تک بیمار تھا۔ پیلیا مارا لگتا تھا۔ بیماری کی حالت میں اس کا تاثر بدل کر اس کی ہمدردی حاصل کر چکا تھا۔ وہ بھی جس کا خیال رکھتی رہی تھی۔ وہی جوان رعنا دل موہ لینے کی گہری، گھنی، مسحور کن اور مستور قوت رکھتا ہے۔ پلک جھپکی نہ تھی کہ ایک انی امروز کمال کے دل میں گڑ گئی۔ یہ خلش کسی کے ساتھ ہمدردی،

ہاسنا یا ہوس نہیں برنگ دگر تھی۔ ایک گھڑی میں' یوسف پورے وجود سے' اس پر چھا گیا تھا۔ امروز' کسی قدیمی عزیز مصر کے زنداں کے بجائے سدا سے قائم پریم محل میں اسیر ہو کر یوسف کی زلیخا بن گئی تھی!

وہ کیا شے تھی؟ کیا جذبہ یا احساس تھا جو کسی بے وفا کی طرح اس کے وجود سے فرار ہو کر دوڑ کر بھاگ کر یوسف کی مٹھی میں جا بیٹھا تھا۔ اسی پل' یوسف نے بھی امروز کو بڑے غور سے دیکھا۔ نظر ملی' نگاہوں کا تصادم متوالا بنا گیا۔ اس کے سامنے اس کے خیالوں میں بسی سندر اور مبہوت کر دینے والی چونکی ہرنی کا ہیجان خیز انسانی روپ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ بڑی بڑی مدھ بھری خوبصورت آنکھوں کی دراز اور سرے پر مڑی مڑی مژگاں کی متحرک جھالر الوہی والہانہ پن طاری کر رہی تھی اور میٹھی' مترنم گفتگو' گفتگو کا سحر' اسکے خوابوں کی مصورانہ تجسیم میں مصروف تھا! یہ سب خوبصورتیاں مل ملا کر' بے محابا اس کے ہوش و خرد کو معطل کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ زلیخا اس کے حواس پر قابو پا لیتی' آج کے یوسف پر وہی پہلی سی مگر قطعی غیر محسوس کپکپاہٹی کیفیت طاری ہو گئی جس نے کیوپڈ کا شکار ہونے سے پہلے' پل بھر میں' یوسف کو' جیتا جاگتا اساطیری دیوتا بنا دیا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑتا لہو انا الحق کے ورد کی یورش کے نشیب و فراز میں گم ہو گیا اور اس کے اندر کی ساری لطافتیں سلب ہو گئیں۔ اس نے نظریں جھکا کر پیغام بھری مٹھی کھول دی۔ مٹھی کھول دی اور دھیرے سے کہا '' آپ میرے گھر میں مسیحا بن کر آئی تھیں۔ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت قدر ہے۔ آیئے میں آپ کو گھر تک پہنچا آؤں''۔ وہ لمحہ جو اس کا اپنا تھا' ذات اور مرتبے پر استوار سماج کی بھینٹ چڑھ گیا پھر جیسے اس کے سارے جسم سے لہو کی ایک ایک بوند نچڑ گئی ہو۔ وہ حیرانی میں غرق ہو گیا۔ اس نے' یہ کیا کہہ دیا؟

وہ ایک غیر مرئی لمحہ تھا' امروز رخصتی کلمات کا تبادلہ کئے بنا' کوئی مدد لیے بغیر' لغزش سے پاک' گھر آ گئی۔ وہ بشر تھی پر کوئی کمزور عورت نہ تھی' راستہ بھر سوچتی آئی کہ انسان کمزور پڑے تو

پینا ئین کی بلندیوں سے پھسل کر گہری کھائیوں' گھاٹیوں میں جا گرتا ہے اور بلوان بنے تو زمین سے اڑ کر چاند پر جا، قدم ثبت کرتا ہے۔ وہ بلندی سے لڑھکی نہ چاند پر گئی پر زمین پر اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔

بڑی عجیب بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر امروز کمال تو سنبھل گئی مگر یوسف کے من میں چھپا شعلہ سلگ اٹھا اور پھر دھڑ دھڑ بھڑکتا چلا گیا۔ یوسف نے امروز کا نین سندیسہ پڑھ لیا تھا مگر اب ڈاکٹر امروز کمال اس کی آنکھوں کی تحریر نہیں پڑھ رہی تھی بلکہ پڑھنے سے کترا رہی تھی۔ یوسف آتا' وہ خندہ پیشانی سے ملتی۔ وہ جس بہانے بھی ملنے آتا، امروز کریدنے' پھرولنے سے صرف نظر کرتی۔ اسے یوسف کی آمد بری نہیں' اچھی لگتی تھی چنانچہ ہمت شکنی سے ہمیشہ باز رہی۔ یوں' جو بات ہونی تھی یا ہونے والی تھی وہ سرے سے کبھی نہ ہوئی لیکن یوسف کی چچی نے جو دھما کہ کیا تھا' امروز کبھی نہ بھلا سکی!

دھیرے دھیرے' ان کے درمیان' آمد و رفت ماند پڑتی اور بے جواز ہوتی چلی گئی۔ کبھی یوسف آجاتا' جتنی دیر چاہتا بیٹھتا' بڑا بے چین و مضطرب و محجوب نظر آتا۔ منہ سے کچھ کہہ نہ پاتا۔ امروز سے سبب چھپا نہ تھا۔ اضطرار و بے قراری کی کیفیت اتنی یک طرفہ بھی نہ تھی مگر ایک خوف اس کیفیت پر' دونوں طرف غالب رہتا! ہاتھوں سے چھٹا سرشاری و دیوانگی کا وہ لمحہ نہ پلٹتا جب دو متوالے رسوائیوں کی پراوہ نہیں کرتے۔۔۔ جب بے قراری اور تڑپن بڑھتی یوسف خط پوسٹ کر دیتا۔ یوسف نے اپنے پہلے خط میں یہ اطلاع پس تحریر کے طور پر لکھی' کاروبار کا نام بدل دیا ہے۔ نیا نام ہے ''امروز یہ جیولری''۔ یوسف کی تنہائیوں کی امین یک طرفہ مراسلت امروز کے پاس محفوظ تھی پھر امروز نے ایک ایک کر کے رقعے نذر آتش کر دیئے۔ کہیں آخری خط رہ گیا ہوگا۔ بھولا بسرا یہ والہانہ محبت نامہ انتیس کے چاند کی طرح طلوع ہوا۔ طلوع ہوا اور اس کے خوابوں کو یاس آلود کر گیا!!

باقی کا سچ یہ ہے' پہلی نظر اور جبری الوداع کی عطا سے' ان کو وہی دو چار سلگتے سلگتے لمحے نصیب ہوئے تھے جنہیں تنہائی دہرایا کرتی ہے!

پھر اصغر ملا اور امروز کو ایک نئے طور پر لے گیا!

یہ اصغر طور اور امروز کمال کی شادی سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔

امروز ابھی تک ووڈز لینڈ نہ جا سکی تھی۔ یوسف کے نام' اس کی شادی کا کارڈ پرس میں پڑا تھا' اسے یاد تھا اور آج اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ دعوت نامہ پہنچا دے گی۔ باہر نکلنے کا موقع نہیں بن رہا تھا۔ فون پر فون آ رہا تھا' معمولی معمولی رہ گئے کام نمٹاتے نمٹاتے شام ہو گئی۔ وہ باہر نکلنے ہی والی تھی کہ یکدم گھن گرج کے ساتھ بادل چھا گئے۔ ہر سو اندھیرا' گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بارش ہونے لگی۔ ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اس نے شہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ آرام کرسی پر آنکھیں موند کر جھولنے لگی۔ ذہن خالی تھا یا خالی نہیں تھا' ایک نامعلوم کیف یا کیفیت تھی۔ وہ کرسی پر جھولے لیتی لیتی شاید نیند میں چلی جاتی۔ اچانک گھنٹی بجی' دستک ہوئی۔ کھڑکیوں پر بوچھاڑ کے ٹکراؤ سے غل سا مچا تھا۔ دستک ٹھیک سے سنی نہ گئی۔ دھیمی سی دستک تیز بارش کی بوندوں میں تحلیل ہو گئی۔ دوسری دستک میں شدت اور پرزور طلبی تھی۔ امروز اٹھی' دروازے پہ پہنچ کر پوچھا ''کون؟'' جواب آیا ''میں''۔ آواز کچھ کچھ مانوس سی لگی لیکن یہ اصغر نہیں تھا۔ اس نے پھر پوچھا ''کون''۔ ''میں یوسف۔ یوسف بے زر!!'' پٹ سے دروازہ کھل گیا۔ ''اندر آ جاؤ۔ تم تو بالکل بھیگ گئے''۔

یوسف کو ہیٹر کے سامنے بٹھا کر' وہ کچن میں چلی گئی۔ یوسف کو بال اور بدن خشک کرتے تھوڑا سا وقت لگا۔ اتنے میں امروز چائے اور لوازمات لے آئی۔ چائے کے دوران وہ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے' تولتے رہے۔ کوئی شکوہ نہیں۔ کوئی شکایت نہیں۔ تو ہے۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ یہی کیا کم ہے؟

''کیسے آئے؟'' امروز نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا۔

''بھول کر آ گیا'' آواز میں شرارت تھی۔ شاید وہ محبت کی محرومی کے گرداب سے نکل آیا تھا۔ ''آپ کیسی ہو؟'' یوسف نے ملائمت سے پیار بھرا سوال کیا۔

تھوڑی دیر پہلے تک ٹھیک تھی مگر گم گم سی تھی'' امروز نے سچ سچ کہہ دیا ''یقین کرو گے؟ میں تیار ہو کر باہر نکلنے لگی تھی۔ بارش اچانک نہ آ جاتی تو میں تمہاری طرف ہی آ رہی تھی''۔ اس نے پرس سے کارڈ نکال کر یوسف کی طرف بڑھا دیا۔

اس قسم کے کارڈ کا مضمون بغیر پڑھے جان لیا جاتا ہے۔ یوسف مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ تھی یا اس کے اندر پیوست کڑواہٹوں کے احتجاج کا الٹا، پلٹا اظہار؟ پھر اس کی مسکراہٹ کپکپی بن گئی جس کی شدت گھونٹنے کی کوشش میں وہی صورت بن گئی جب اسے امروز نے پہلی بار بیماری میں کانپتے' کپکپاتے دیکھا تھا۔ یہ لرزش' امروز دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی وہ اچانک کس موڑ پر آ کھڑے ہوئے ہیں؟ وہ دلاسے کے لیے اٹھنا چاہتی تھی مگر اٹھ نہ سکی۔ ہمت کھو گئی نہیں، وہ قابو میں رہی۔ وہ جانتی تھی یوسف اسے سادگی اور خلوص میں ڈوب کر، ملنے آیا ہے۔ وہ اسے پریشان کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر پھر بھی وہ پوچھنا چاہتی تھی ''مدت بعد آئے؟ کیوں آئے؟ کس لئے آئے؟'' پوچھ نہ پائی' کچھ نہیں سوجھ رہا تھا!

پیالیوں میں آدھی بچی چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔ بارش تھم گئی تھی۔ بادل نہیں چھٹے ہوں گے۔ اندر باہر اندھیرا تھا۔ روشنی کم کم تھی۔ بجلی کے بلب کمزور پڑ رہے تھے۔۔۔

''چلتا ہوں'' یوسف نے کہا۔

امروز چپ رہی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی ''آج بھی بن بتائے' بنا بولے' چلے جاؤ گے؟'' نہیں شاید کہنا وہ یہ چاہتی تھی ''آئے ہو۔ اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ کچھ دیر کے لیے بیٹھو! بیٹھو تو سہی'' مگر خاموشی سے یوسف کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئی' رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی۔

یوسف قدم لیتے لیتے رکا' پلٹا! اس نے کوٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور التجا کی

''آنا' آؤ گی نا؟''۔

دعوت نامہ پڑھے بغیر' امروز کو بھی معلوم ہو گیا' یوسف کی شادی ہو رہی ہے۔ تاریخ یا تفصیل جاننے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سب کچھ کارڈ میں لکھا ہوگا۔

''یوسف جا رہا ہے'' ڈاکٹر امروز کمال کے اندر کی زلیخا نے جتلایا ''یوسف جا رہا ہے'' زلیخا مسلسل یاد دہانی کرا رہی تھی۔

یوسف نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

امروز نے یوسف زرگر کی پشت پر جھولتے ہوئے ٹاپ کوٹ کا دامن تھام لیا۔

سچ مچ

ایک جنون تھا'
آرزو تھی
کسی کو پالینے کی تمنا!
چاہت جو مرتی نہیں'
جوانی کی طرح مرجھاتی نہیں!
میری رگ رگ میں پیوست تھی۔
ناصبوری کو دبا کر'
دل کے کسی گوشے میں چھپا کر'
سلا کر'
سارا وقت گزار دیا!!

مگر' میں اپنی تمام تر غفلتوں اور شعوری کاہش کے باوجود اسے بھلا نہ پایا' وہی دیرینہ آرزو' امٹ تمنا کسی کو پالینے کی خواہش' جنون بلا خیز کی طرح انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی!! آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی یک بیک دہک اٹھی۔

بے قراری'
پہلے سے زیادہ بے چینی'
آرام چھن گیا تھا!

دبی لگن،

چبھن،

بے کلی،

بے سبب ہی بڑھتی چلی گئی۔

نیند کھو گئی۔

جستجو نے آگھیرا۔

حالات کی تبدیلی،

موہوم سے امکانات کی روشنی کے آسرے پر،

ماضی میں آئندہ تلاشنے کے لئے،

پیچھے چھوڑی ہوئی پرچھائیوں کو لمحۂ موجود سے مربوط کرتے ہوئے، آنے والے زمانوں میں اپنی آرزوؤں کا روپ دینے کے لئے، میں بے اختیار اٹھا،

رخت سفر باندھا،

ان گنت سوالات کا طومار لئے،

شہرِ نگار و دل نثار کی طرف چل پڑا!!!

ایک یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا، اپنے تن من سے لپٹی تلخیوں کی کینچلی اتار پھینکے گا!

جیسے کل ہی کی بات ہو۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے فوراً بعد، مجھے اپنوں سے دوری اور جدائی قبول نہ تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی، روزگار پا لینے کی امید تھی مگر یہ پاپا کی ترغیب تھی۔ آئندہ ترقی

اور آسودگی کے بہتر مواقع کی امید تھی جس کے پیش نظر مشرق سے دور مغرب میں نئے دیس کی جانب سہانے مستقبل کے حصول کے لئے طویل سفر اختیار کیا۔

یہ ترک وطن نہیں تھا۔

میرے وہم وگمان میں نہ تھا کہ وطن واپسی مسدود ہو جائے گی۔ میرے گھر والے فرقہ وارانہ فساد میں مارے جائیں گے۔ میں پردیس میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ دیس میں سیما کھو جائے گی جیسے اس کا ہونا نہیں کھو جانا حقیقت تھی اور مجھے اس حقیقت کی دکھ بھری داستان سنانے والا بھی نہ ملے گا۔

مانتا ہوں، یہ دنیا ہے جنت نہیں! ایک طبقے کے لئے خوشیوں کا گہوارہ تو دوسروں کے لئے دکھوں کا گھر! اقلیت ظلم سہتی ہے۔ نفرتوں کا نشانہ بنتی ہے۔ بے گناہ موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ فرد فرد کو اپنی شناخت کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیا سیما کو اسی بنا پر سزا بھگتنی پڑی؟
اس پاداش میں سیما کو کیا سزا ملی؟
موت یا زندہ در گور کر دی گئی؟ بڑا پریشان کن اور تڑپا دینے والا سوال تھا۔

وہ میری ہم سبق، بچپن، اسکول، کالج یونیورسٹی کی دوست تھی۔ جوان نازک خوبصورت اور شیریں گفتار۔ تعجب کی بات ہے اس کے گھر والے بھی لاپتہ ہو گئے تھے۔ کیوں؟ کیا ہمارے پڑوسی ہونے کی وجہ سے زد میں آئے؟ مجھے ان کا بھی غم تھا۔ پریشانی بڑھ گئی تھی۔
بالفرض ان لوگوں نے نقل مکانی کی تو سبب کیا تھا؟ یہ محلّہ تو سیما کا ننھیالی محلّہ تھا!

محلے میں،

کسی کو ان کا پتہ نشان معلوم نہ تھا۔ ان کی گمشدگی کا بھید' پڑوسیوں کی خاموشی سے زیادہ گہرا تھا۔
گلی گلی چھان ماری'

پتے پتے' بوٹے بوٹے سے حال پوچھا'

کچھ پتہ نہ چلا'

خبر نہ ملی۔

وہ لوگ ایسے کھوئے'

کوئی سراغ نہ ملا!

اس کو'

سیما کو'

سیما کے گھر والوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا؟

دنیا اندھی ہو گئی تھی۔ کان بہرے، ہونٹ سل گئے تھے۔

ایک سناٹا تھا اور میں تھا'

اکیلا!

تنہا!

میرے قدم شل ہو گئے'

پر میں چلتے چلتے تھما نہیں'

شاید تھک گیا ہوں گا؟

نہیں'

پھر یہ ہونے نہ ہونے کی بے کیف دردیلی کیفیت کیوں محسوس ہو رہی تھی' مسوس رہی

تھی۔کوئی شک نہیں چرکا لگا تھا۔خون رستا تھا اور رس کر کھرنڈ کی طرح جم گیا تھا۔

یہی دھن تھی کھوج لگاؤں گا۔

اسے،

سیما کو،

اس کی ممی، ڈیڈی کو تلاش کروں گا، ڈھونڈ لوں گا، کھوج لوں گا۔

پل پل کرتا سمے مہینوں میں ڈھل گیا۔

سیما نہ ملی۔

اچانک،

ایک روز،

شہر سے باہر نئی بستی میں اس کی ممی ڈیڈی مل گئے!!

میں نے چاہا، ان کو بتاؤں، تالکٹورہ گارڈن کے کونے کونے میں ڈھونڈ آیا ہوں۔املی کے اس درخت سے بھی سیما کا پتہ پوچھنے گیا تھا۔جس کے نیچے ہم دھوپ سے بچنے کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔پھر اچانک اٹھ کر، اطمینان کرتے کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا؟ تب پتھروں سے نشانہ لگاتے املی کے گرتے پھول چنتے اور کتارے کھاتے تھے۔میں ایڈورڈ کلب کے اس تھیٹر میں بھی ہو آیا تھا جہاں ہم دونوں ہمیشہ لکتے چھپتے، گھس کر بنگالی ڈرامے دیکھا کرتے تھے۔اس شرارت کا لطف ہی اور تھا۔قریبی بنگلے میں آنٹی وکٹوریہ کے پیانو کو چھیڑنے اور ان کی انگریزی گھرکیاں سننے جاتے تھے۔وہاں، آنٹی کے بنگلے میں، اب ایک پنجابی فیملی آباد تھی۔آنٹی دنیا ہی سے اٹھ گئی تھیں۔

ان کا پیانو برآمدے میں ٹوٹا پڑا تھا۔ ہمارا اسکول کسی نئی عمارت میں چلا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک پلازا بن گیا تھا۔ بڑی خاک چھانی' وہاں کوئی شناسا چہرہ نہ تھا مگر یہ سب کہنے کے بجائے میں خاموش رہا چپ لگ گئی ایک لفظ نہ بول پایا۔ دونوں بزرگوں کو دیکھتا رہا وہ زندہ درگور تھے ۔ادھمرے' رنجیدہ' غمزدہ، چور چور، تھکے تھکے، بھٹکے بھٹکے سے ۔۔۔۔جیسے خالی بھائیں بھائیں کرتے امدای کیمپ میں زخمی ہوکر ابتدائی طبی امداد' فرسٹ ایڈ کی آس پر صرف وہی بیٹھے ہوں۔ وہ میر امداوا کیا کرتے؟

وہ دونوں ناتواں اور ضعیف تھے میری چپ کے آگے ہار گئے'
گتھلی کھلی'

دراصل فرقہ وارانہ فساد کے دوران' حملہ ان کو سزا دینے کے لئے ہوا تھا۔ سوچا سمجھا منصوبہ تھا' بلوائی سیما کو اٹھا کر لے گئے۔ چیخ پکار سن کر بھی کسی نے مدد نہ کی۔ پولیس نے الٹا دھتکار دیا۔ غنڈوں نے باہر نکلنا دشوار کر دیا۔ حالانکہ سیما کی ممی انہیں کے فرقے کی تھیں۔ ایک غیر مذہب سے شادی انہوں نے کی تھی۔ وحشیوں نے بھیانک بدلہ ایک معصوم لڑکی سے لیا۔ اسے پامال کیا' روندا' تباہ برباد کر دیا گیا۔

میں جتنی دیر ان کے پاس بیٹھا، تلخیاں حواس نوچتی رہیں۔ پورے بدن میں سوئیاں چبھتی رہیں۔ نہیں معلوم کیا کیا؟ کیا سنا؟ یا پھر وہ سب میں کیسے سن اور سہہ سکا؟ نہیں معلوم، انہوں نے میری دیوانگی کو کیوں کر برداشت کیا ہوگا۔ عجب مخمصہ تھا۔ سماعت پر گونگی صداؤں کی یلغار تھی۔ اندھی چیخیں کرلا رہی تھیں۔ خرد تھی نہ ہوش تھا۔ وہ، وہ نہ تھے۔ میں، میں نہ تھا۔ آس پاس بلوہ کرنے والے دہشت گرد بھی نہ تھے۔

رخصت کرتے ہوئے سیما کی ممی نے سرگوشی میں بتایا'

''وہ زندہ ہے!''

''وہ لٹی پٹی واپس آئی تھی۔ اس نے بولنا چھوڑ دیا تھا میں اور اس کے پاپا اسے دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ ہمارے بھیتر تک سے لاج' ہمت اور شردھا نوچ لی گئی تھی ایک ایک محلے دار ہم سے گھن کرتا' کراہت کھاتا۔ کوئی فریاد سننے یا بات کرنے تک کا روادار نہ تھا۔ پھر ہم ایک دوسرے سے چڑا کرتے' لڑا کرتے اور ڈھے جاتے۔ ہم تو سڑ بُس گئے تھے۔ ہماری سوچ بھی مریض ہوگئی تھی۔ اسی کو دوش دیا کرتے کہ مرجاتی۔ یوں بے آبرو ہوکر نہ آتی! اس ناشاد، بدنصیب نے پلٹ کر نہ کہا کہ تم ہی مرجاتے۔ اب سوچتی ہوں شاید اسی لئے وہ ہمارے رویے سے دلگیر و پریشان ہوکر ہمیں چھوڑ کر کہیں روپوش ہوگئی۔''

بوڑھی، مرگھلی، میلی میلی آنکھوں والی آنٹی نے سانس لے کر بات کا سرا جوڑا۔ ہم اتنے تنگ آگئے کہ محلّہ چھوڑ چھاڑ کر اس نئی مضافاتی بستی میں آبسے۔ یہاں کسی کو اس کے لٹنے کی خبر تھی نہ ہمیں کوئی جانتا تھا۔ قریب میں رہنے والے بھی سمجھنے لگے تھے۔ کہ اس اجڑے پُجڑے' شمشان کے سے' سناٹوں بھرے گھر میں ایک بوڑھا شخص اور ایک نسبتاً کم صغیف عورت رہتی ہے!''۔۔۔ جیسے وہ بے اولاد تھے!

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ آنٹی ایک سہمی ہوئی چڑیا کی مانند تھیں یہ میں جانتا تھا کہ خوف سے ان کی زبان پر بٹیا کا لفظ یا اس کا چھوٹا سا' پیارا سا نام نہیں آرہا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اب وہ ان کے لئے ایک ایسی کم نصیب' اجنبی لڑکی ہو جس کا نام ہی وہ بھول گئی ہیں یا کسی سماجی اور نفسیاتی وجہ سے ایک تجریدی بپتا کہہ کر اپنا من پرچا رہی ہوں۔ ادھر مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ تصدیق کے لئے پوچھتا'' وہ کون؟ آنٹی کس کی بات کررہی ہو؟''

اس بیچ میں چند لمحوں کا وقفہ آیا'

صدیوں پر محیط لمحہ!

''ہاں وہ ایک بار یہاں بھی بھیک مانگتی آئی تھی!''

ایک بار پھر پوچھنا چاہتا تھا ''کون؟'' نہ پوچھ پایا۔ حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ مجھ میں تعجب کے اظہار کی بھی طاقت نہ تھی۔ انہوں نے میرے ہونٹوں کے کھلے رہ جانے کو نظر انداز کر دیا اور جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔۔۔

بے جوڑ' بے جڑ' ان گھڑ' درد بھری کہانی کا اوجھل' بوجھل موڑ سامنے آ گیا! (وہ۔۔۔ سیما! جانے کون؟ اجنبی! پرائی!) ایک مرتبہ پھر ان تک پہنچ گئی تھی۔ ٹوٹی' بکھری' بے سکت' بت کی بت!!

ایک غم رسیدہ ماں کے بند لب' اداس اور ویران آنکھوں سے لہو کہانی ابلی پڑ رہی تھی۔ جس کی بچی کو غنڈوں نے اغوا کیا ہو' آبرو لوٹی ہو' اس سوختہ تقدیر بیٹی' اس جل نصیبی کو اپنانا' اسے پناہ دینا' اجاڑ ماں' حواس باختہ باپ پر لعنتوں' طعنوں اور ملامتوں کے جہنم کا در نئے سرے سے کھولنا تھا۔

حادثے کے بعد وہ دونوں جان تو نہ دے سکے تھے مگر اب وہ اس دہشت گردی کی واردات کو بھلا کر' بیٹی کے گم ہو جانے پر' اپنے ماضی ہی سے منہ موڑ بیٹھے تھے دو لفظوں کی کہانی یہ بنتی ہے کہ وہ اپنے پرکھوں کا محلہ چھوڑ کر' نئی جگہ آئے اور خود سے اجنبی ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے جو کچھ کہا وہ کسی اور کی داستان تھی!

مجھے الوداع کہتی ہوئی لاغر خاتون جب کبھی نادان سی لڑکی ہو گی سارا جگ اپنے پاس

کھڑے ٹنڈ منڈ درخت بے سایہ شجر یا ہونق اور نیم پاگل جیسے شخص پر نثار اور قربان کر سکتی تھی۔۔۔۔
وہی شخص آج بھی اسکے دل کا سہارا تھا بیٹی کے بعد اسے چھوڑنا اسکے بس میں نہ تھا۔

میں حیران تھا وہ دونوں' اب تک مرکھپ کیوں نہیں گئے؟

ناتواں' کمزور بیچ منجدھار، ہچکولے کھاتے دو افراد معلق تھے۔ ڈوبتے تھے نہ کنارا پاس تھا۔ ان کے خوف زدہ چہروں پر تحریر پیغام میں نے پڑھ لیا کہ دوبارہ ان کا دروازہ نہ کھٹکھٹاؤں۔ اس کے برعکس میری فکر کا الاؤ پوری طرح جل اٹھا۔ تالیف وتلافی کی سوچ نے جذبوں کو تیز کر دیا۔ دید کی پیاس بڑھا دی۔

میں'
گھر کا نہ گھاٹ کا!
پھر بھی'
جی رہا تھا'
میں نے آنکھیں موند لیں اور سوچ کے پاتال میں اتر گیا۔
آگے'
گپھا' گھپ اندھیرا' جگنو' تپش سورج؟
ہر شے گڈمڈ!
یوں'
دن' دن تھا رات' رات تھی۔

لیکن؛

ہر طرف خلا ہی خلا تھا۔

میں نہ تھا وہ نہ تھی وہاں کوئی نہ تھا!

پیچھے' ایک گھروندا تھا'

نہ رہا'

اجڑ گیا۔

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی؟ ☆

تیس سال ایک لمبی مدت ہوتی ہے۔

ہوتی ہوگی'

لیکن چمن لٹتے' آشیاں تاراج ہوتے دیر نہیں لگتی۔

اے بے بسی! اے بے بسی!

نگری مری برباد ہے برباد، یونہی برباد رہے گی

کب تک برباد رہے گی؟-------

تاریکی کی لمبی سرنگ کے دوسرے سرے پر ایک رہ گئی کرن دیکھی جا سکتی تھی۔

گل اپنے گھر خوش تھی اور گلزار بیوی میں مگن تھا۔ گھر ہمارا ٹوٹا تھا، بچوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ میرا یا میری بیوی کا بھی کوئی دوش نہ تھا۔ ہمارے درمیان پہلی نظر میں محبت یا بار بار کی ملاقات سے لگاؤ پیدا نہ ہوا تھا۔ طرفین میں سے کسی کے قلب و جگر سے رضامندی یا قبولیت نہ پھوٹی تھی۔ اس کے والدین اور میرے ملنے والوں نے شادی طے کرا دی اور ہم نے پرائی نگری میں ایک چھت کے نیچے آ کر والدین اور اپنے خیر خواہوں کی پرانی نسل کے لیے تسکین کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔

تیس سال گزر گئے پھر صفورا کے جی میں کیا سمائی ''ویمن لب کے ساڑھی گروپ'' میں شامل ہو کر مجھے چھوڑ گئی۔ جہاں نالہ پابند نے نہ ہو، فکر آزاد ہو، فارغ البالی ہو' ارینجڈ میرج نہیں چل سکتی۔

سب کچھ چھوڑا'

پیچھے مڑ کر نہ دیکھا'

گویا پردیس گھوم گھام کر' دیس آ گیا۔ ہاتھ خالی تھے۔ مٹھی میں دریدہ دامن کی ایک کرچی کوئی دھجی نہ تھی۔ آنے والے وقتوں کا بوجھ لادے' ماضی میں گھسٹ آیا' گھسٹتا آ گیا تھا اور جو نہ دیکھا تھا وہ بھی دیکھ لیا۔ گھر والوں کے مارے جانے اور سیما کے گم ہو جانے کے صدمے سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ خدا یاد آ رہا تھا۔

میں پرانے شہر کی بادشاہی عبادت گاہ میں ہری ہری کرنے لگا۔ بندگی میں میرا دل نہ لگتا، ورد کرتا ''میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں معبود' میری آواز بے در و دیوار گنبد سے ٹکرا کر بن کچھ پائے، پلٹ آتی۔

میں بڑی عبادت گاہ میں کبھی شمالی دروازے سے کبھی جنوبی دروازے اور کبھی مشرقی دروازے سے داخل ہوتا۔ وہاں ایک ہجوم ہوتا۔ عابد' زاہد' سیاح' اجنبی دور دور سے آتے جاتے لوگ، گلفروش' جنتری فروش' کپڑے والے، جوتے والے' ان کے علاوہ پھل والے' کنجڑے' کبابیے' خوانچوں پر خوردنی چسکے دار اشیاء سجائے گلے پھاڑ رہے ہوتے۔ سینکڑوں فقیروں' ناداروں اور معذورین کی ہمہ وقت بھیڑ ہوتی۔ میں سب سے بے نیاز سر بسجود رہتا۔ اس دربار میں سب کچھ

لٹا کر آیا تھا ایک ہی آرزو تھی۔ کسی کو پا لینے کی تمنا تھی۔ ملے نہ ملے آس تو تھی'

آس تو ہے۔

ہے' ہے!

کڑاکے کی سردیاں تھیں۔ سورج بجھا بجھا سا تھا۔ بادل تھے۔ ناگوار خنک اور خشک ہوا تھی۔ وہ تہوار کا دن تھا۔ معمول سے زیادہ ہجوم تھا۔

معروف' معزز' مقدس' صوفی' پرہیزگار شخصیتیں' کاروباری شہری، پھیری والے' پاپی' امیر غریب و فقیر تھے۔ بے خبری میں جل دینے والے، کفن فروش جیب کترے ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کے لیے اکھٹے ہو رہے تھے۔ آتے چلے جا رہے تھے۔ میں مشرقی دروازے کی سیڑھیاں عبور کر کے محراب اندر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ کھوے سے کھوا چھلا۔ فوراً دھیان بٹا' ذرا پرے خستہ حال، پھٹے لبادے میں ایک عورت سے نگاہ ٹکرائی۔ وہ منگتی بے ساختہ پکاری ''کب آئے؟'' ڈھنگ سے جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا۔ ریلے میں اندر چلا گیا۔ اس صدا' اس صورت کو جیسے پہچان لیا ہو۔ سوچا یہی امکان تھا' عبادت کے بعد مل لوں گا۔ مقدس رسموں کے درمیان روح بھٹکتی رہی۔ سچائی جتلا رہی تھی یا مغالطہ دے رہی تھی۔ عقل چغلی کھا رہی تھی۔ میری من بسیا منگتوں کے غول میں گھری ہوئی تھی۔ سبھی دست سوال دراز کر رہے تھے۔ اس نے کس سے (مجھ سے؟) پوچھا تھا؟ صاف صاف الفاظ میرے کانوں میں پڑے تھے۔ وہ فراموش فراموش سی مانوس صدا مجھی سے مخاطب تھی۔ اس نے مجھی سے پوچھا تھا ''کب آئے؟''

جانے کب سے غنودگی میں تھا' سحر کی سی کیفیت میں تھا۔ بے بسی تھی یا بے حسی سی تھی مگر روح میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا۔ وہ مل گئی جس کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ پل' وہ گھڑی دور نہیں

جب ملیں گے۔ واعظ کی واعظ جانے، اس کی تاکید و وعید سے مجھے کچھ سروکار نہ تھا۔ پیشوا کا فرمان سر سے گزر رہا تھا۔ سمجھ سے، سماعت سے ماورا تھا۔ لب کہتے ''میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں'' جبکہ میں غیر حاضر تھا۔ میں بھول گیا وقت دعا ہے۔ شکر ادا کرنے کا سمے ہے۔ دل نے کہا خدا نے سن لی۔ وہ مل گئی؟

قبولیت کے بعد کیسی دعا؟

حاجت مند مناجات میں مصروف تھے۔ میں الگ ہو کر، متلاشی نظروں کے ساتھ باہر آیا مگر میری طرح بیرونی دروازے کا رخ کرنے والے بے صبروں کے سمندر میں ہجوم کا حصہ ہوتے ہوئے فرد لہر در لہر بن کر سمندر میں مدغم ہو گیا۔

وہاں بھیڑ ہی بھیڑ تھی۔ وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ گروہ در گروہ ڈھونڈا، وہ نہ ملی جس نے پکارا تھا ''آ گئے؟'' مجھ پر ایک رجائی کیف طاری تھا۔ اس وقت نہیں ملتی نہ ملے پر آس یقین میں بدل چکی تھی۔ وہ یقیناً وہاں موجود ہے۔ وہی تو تھی جس نے دور سے پکار کر پوچھا تھا ''کب آئے؟'' اس آواز نے، میری سماعت سے مس ہو کر، میرا خالی من امید سے بھر دیا تھا۔ وہ یہیں کہیں ہے۔ یہیں ملے گی۔

کسی وقت،

ابھی،

اسی وقت،

کبھی تو ملے گی!!

اور،

ایک روز،
وہ مل گئی!

ہم ایک دوجے کو پہچان گئے تھے۔ مدتوں سے جن نقوش کو دلوں کے چور گوشوں میں چھپائے، دور دور، جیسی نصیب ہوئی، اپنی اپنی سی، زندگی کر رہے تھے۔ دور کی آشنائی یا اجنبیت نہ تھی کہ جھجک، ہچکچاہٹ یا کھنچاوٹ کا شائبہ درمیان آتا۔ شکر خدا! دوریاں مٹ گئیں۔
پچھتاوے بھسم ہوگئے۔ کوئی تمہید تھی نہ انت۔ مست قلندر مست!

وہی،

پہلا،

حتمی سوال،
"کب آئے؟"
"یہی پل، دو پل بیتے ہوں گے" غلط نہیں کہا تھا "سویرا تو آنکھ کھلنے پر ہی ہوتا ہے نا؟"
بے یقینی اور وسوسے کے بغیر پوچھا "پھر کب ملو گے؟"
"اب جدا نہ ہوں گے"۔

لب مچل رہے تھے۔ کپکپا رہے تھے۔ الفاظ کی یورش تھی۔ بے ڈھب گفتگو طول پکڑتی گئی۔ میں سیما کو لے کر اپنے ٹھکانے پر جانا چاہتا تھا، وہ مجھے کھینچ کھانچ کر مشرقی دروازے کے دائیں جانب لے گئی۔ جس کے سامنے بازار دری والان ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر، اس تالاب کے پاس جہاں اندر سے مقدس حوض کا استعمال شدہ پانی آ کر گرتا تھا۔ اس تالاب کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ ایک دیوار کی بند محراب کے نیچے کوئی لیٹا ہوا تھا۔ سیما نے اس سے حال پوچھا اور اپنے بوجھے سے کچھ نکال کر اس کے منہ میں ڈالا۔ میں پاس کھڑا تھا۔ سیما نے نحیف

مریضہ کو کھلانے سے فارغ ہو کر اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا ''ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں''۔

خیالوں میں رہنے اور عملاً کسی دوسرے کے ساتھ رہنے کا'

فرق'

میں'

کھڑے کھڑے'

جان گیا۔

اس جانے' انجانے دھکے سے میں سکتے کے عالم میں چلا گیا حالانکہ سیما مجھے ایک میلی کچیلی منگتی کے روپ میں ملی تھی پھر بھی بیتے دنوں کی رفاقتوں اور آسائشوں کی یادوں کے مضبوط حصار میں تھی۔ موجودہ حالات کی پستیوں کے مشاہدے نے میرے تن بدن میں ایک ساتھ ایورسٹ کی یخ ناکیوں اور صحرائے عرب کی جھلساہٹوں کی پچکاری لگادی! پر میرا دل بدستور' سیما کی محبت سے معمور تھا۔

رتی رتی کر کے سوچ جاگی۔ حواس جمع ہوئے تو میرا ذہن کام کرنے لگا۔ مریضہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ ''میں ابھی آیا'' میرے منہ سے پہلا بے ساختہ کلمہ نکلا۔ شاید میری کیفیت و حالت چھپی نہ رہ سکی ہو۔ شاید سیما یونہی' کسی قدر' تشویش میں مبتلا ہوئی ہو اس کی طرف سے ایک تیر آ کر لگا، اس نے ''میں ابھی آیا'' کا حوالہ دیئے بغیر کٹار ماری ''تمیں سال بعد؟'' اور سیما نے مشکوک نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔ ''چند منٹوں میں لوٹ آؤں گا'' اور کیا کہتا؟ تسلی دیئے بغیر میں بھاگا بھاگا نزدیکی کیمسٹ کے پاس گیا۔ اپنی سمجھ کے مطابق مریضہ کے لئے کھانسی اور مالش کی دوا لا کر

سیما کے حوالے کی اور چپ چاپ ڈاکٹر کی تلاش اس کو لانے' بلانے کے لئے نکل پڑا۔ شاید سیما کے دامن سے نکل جانے والا اعتبار پلٹ آیا تھا' اس نے بھی کچھ نہ پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کب اور کتنی دیر بعد آؤ گے؟

ڈاکٹر مریضہ کے ارد گرد کا ماحول' کھلا آسمان' ٹھنڈی زمین' جھر جھری رضائی بے رحم موسم اور ناک سے ٹکراتے تعفن سے ضرور گھبرا گیا ہوگا۔ اس نے ادھر ادھر یوں دیکھا جیسے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے! میں سامنے کھڑا تھا۔ مصلحتاً ہاتھ میں والٹ (بٹوہ۔ پرس) تھاما ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بیگ سے انجکشن نکال کر مریضہ کو لگا کر کہا ''کسی شفا خانے میں داخل کرانا مناسب ہوگا'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ رکھ دیئے۔ ڈاکٹر بھلا مانس تھا انجکشن کے پیسے رکھ کر باقی لوٹا دیئے۔ اس نے اپنی فیس بھی نہیں لی۔

سمے کی نزاکت نے تکلفات کی چادر درمیان سے کھسکا دی' گرا دی تھی۔ مریضہ کو پرائیویٹ کلینک میں داخل کرا دیا گیا۔ انتظامیہ محتاط اور اپنے ضوابط کی پابند ہوتی ہے۔ اس پر کلی طور پر اپنی مرضی تو نہیں تھوپی جا سکتی۔ وہ مریضہ کو علیحدہ کمرہ دینے سے انکار کر رہے تھے۔ عذر یہ تھا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے وہ قاصر ہی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں انہیں ادائیگی کے بارے میں شبہات ہوں گے۔ انتظامیہ کی تسلی کے لئے مناسب پیشگی ادائیگی کر دی اور اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک مریضہ سو نہ گئی۔ میں سیما کو اپنے ساتھ لے آیا وہ اپنی جھولی ٹھکانے پر ہی چھوڑ آئی تھی مگر لباس پھر بھی ناموزوں سا تھا۔ راستے میں پہننے کے لئے ایک دو جوڑے لینے پر وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوئی۔ میرے خلوص کے آگے انکار نہ کر سکی۔ اس میں ضد سے زیادہ جھجک کا عنصر تھا۔ سیما کی طبیعت میں فروع سے توازن ہے۔ وقت کی مصلحت اور تقاضہ سمجھنے کی اہلیت

ہے۔ حالات کی طویل ناموافقت بھی اس کی فطرت کا اصل جوہر یا بنیادی کردار مسخ کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی میرے اصرار پر، میری بات مان لینے میں یقیناً یہ احساس بھی شامل ہوگا کہ محض تن پوشی کافی نہیں کہ لباس شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور نئے شب و روز کی عکاسی کے لئے حلیہ بدلنا ضروری ہے۔

سیما ہسپتال سے اچھا تاثر لے کر آئی تھی۔ دوست کی طرف سے کسی قدر اطمینان ہو جانے پر تناؤ کم ہو چکا تھا اور جب وہ نہا دھو کر نئے لباس میں کمرے میں آئی تو اس کی شخصیت نکھر کر کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ ماہتاب جگمگانے لگا تھا۔ جیسے عمر اور زمانے کے ادبار کا سایہ تک اس پر کبھی نہیں پڑا۔ رات تھی، چاندنی پھیلی ہوئی تھی، ایک چاند آسمان پر اور دوسرا چاند میرے کمرے میں اترا ہوا تھا۔ رخ روشن پر نگاہ ٹھہرنے کا نام نہ لیتی تھی۔ میں آسمانوں پر خدا کے وجود کا منکر نہیں وہی حاضر و ناظر ہے۔ اس وقت وہاں میں تھا اور وہ تھی، میں کہاں تھا وہی وہ تھی!!

سیما بھکارن کیسے بنی؟

میں نے مناسب نہ سمجھا اس سے کچھ پوچھتا، قیاس کیا تھا۔ سیما کا غنڈوں سے بچ جانا، زندہ رہ جانا، اپنی جگہ المیہ تھا۔ غنڈوں کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ وہ یہ جان کر شیر ہو گئے ہوں گے کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہے۔ سماج کی نظروں میں وہ ایک داغی لڑکی تھی۔ اس کے والدین بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ وہ مفت کا مال ہے۔ اسے چھڑانے کوئی سامنے آیا نہ آئے گا۔ لہذا انہیں معمولی سا خوف بھی نہیں رہا ہوگا۔ انہوں نے سوچا ہوگا وہ جب چاہیں گے، اسے اٹھا لے جائیں گے، تاراج کر کے اپنی ہوس پوری کر سکیں گے۔ اس کی مدد اور سہائتا کے لئے کبھی کوئی

نہ آئے گا۔ بے سہارا سیما کے لئے گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا ہو گا۔ وہ سماج سے بدلہ لینے کے لئے ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ کر کسی کوٹھی میں، کسی کوٹھے پر منتقل ہو کر عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھی۔ وہ جس پولیس اسٹیشن میں دادرسی کے لئے گئی اس کا انچارج اسے رکھیل بنا کر پناہ دینے کی تجویز دے چکا تھا اور جب ایک تعلیم یافتہ باضمیر اور باہمت لڑکی تھک ٹوٹ کر رہ گئی ہو، تب شاید ---۔شاید اس نے یہی نتیجہ نکالا ہو گا وہ جوگن بن جائے، منگتی بن جائے۔

مجھے سیما نے صرف اتنا اشارہ دیا تھا جب اس کے ماتا پتا کی ختم نہ ہونے والی اذیت انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ ان کو عذاب میں ہر گھڑی کڑھتے دیکھنے سے عاجز آ گئی اور مجبور ہو کر گھر چھوڑا تو وہی پرانے فسادی غنڈے تعاقب کر رہے تھے۔ جیسے جان گئے ہوں کہ سیما اپنے اوپر اپنے ہی گھر کا دروازہ بند کر کے نکلی ہے۔ اب وہ ہمیشہ ان کے رحم و کرم پر ہو گی۔ وہ اسے دبوچنے کے لئے تاک میں تھے۔ شاید دن کا اجالا رکاوٹ بن رہا تھا سیما سہم کر، بے بس ہو کر، ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ غنڈوں کے ڈر خوف سے زیادہ اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ ہار نہیں مانے گی۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا، آسمان نے اچکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دھرتی پر نظر کی، زمین کھا جانے سے منکر ہو گئی۔ بڑا کڑا وقت تھا پھر بھی وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا بدمعاش غنڈے اسے اچکا ہی چاہتے ہیں۔ اچانک وہ ایک موڑ مڑتے ہوئے کسی سی ٹکرا گئی یہ ایک بدحال، چیتھڑوں میں لپٹی فقیرنی تھی۔ شاید غیب سے اس کی مدد کے لئے وہاں کھڑی تھی۔ وہ سیما کی بانہہ پکڑ کر اسی گھر میں گھس گئی۔ جہاں خیرات کے لئے سوالی بن کر کھڑی تھی۔ یہ اس کی ذہانت تھی کہ وہ سیما کو گھسیٹتے ہوئے بے سوچے سمجھے کسی اجنبی گھر میں بے دھڑک گھس گئی۔ انہیں دوڑتے بھاگتے دو ایک لمحوں میں اتنی مہلت مل گئی کہ وہ پیچھا کرنے والوں کی دسترس اور زد میں آنے سے بچ گئیں۔ ان کی آہٹ اور موجودگی سے مکین فوراً ہی باخبر ہو گئے اور بداعتمادی میں ان کو

چور سمجھتے ہوئے ایک پل ضائع کئے بغیر دھتکار اور پھٹکار کر نکال دیا۔ انہوں نے دھمکی تو پولیس کے حوالے کرنے کی بھی دی تھی مگر منت زاری پر رحم کھا کر باہر دھکیل دیا۔

یہیں سے دو اجنبی غیر واقف عورتوں کی امٹ اور امر سنگت شروع ہوئی۔ ان کی دوستی ہوگئی لیکن اگلے دو ایک روز میں سیما پر آشکار ہو گیا' فسادی غنڈے ہی نہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی بری نظروں سے بچنے کے لئے بہروپ بھرنا ہوگا اسے معلوم ہوگیا تھا کہ ہر پیشے کے کچھ تقاضے اور حلیہ ہوتا ہے۔ فقیر کی گدڑی میں لعل ہو نہ ہو، فقیر اور چیتھڑے لازم وملزوم ہیں۔ سیما نے اس لئے' اپنا من میلا نہ کیا تن کو میلی کچیلی لیروں سے ڈھانپ لیا! وہ جانتی تھی ایک راستہ اس بازار میں بھی جاتا ہے جہاں اسے عیش وشادمانی کی زندگی گزارنے کے لئے اپنے بدن کی زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔ سیما سچ مچ کی مانگنے والی بن گئی۔ اس طرح، اس نے خدا کے گھر کی سیڑھیوں پر پناہ لینے کو نت نئے ہاتھوں برباد ہونے پر ترجیح دی۔ ایک بے ٹھکانہ بے آسرا جوان با ضمیر لڑکی کو اسی میں عافیت نظر آئی۔

اسے پناہ دینے والی بھی اسی کی طرح مصیبتوں کی ماری تھی مگر وہ مضبوط قوت ارادی کی مالک عورت تھی لگتا تھا پڑھی لکھی ہے دونوں میں ہم ذہنی پیدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوگا۔

سیما نے ضرورت نہ سمجھی کہ مجھ سے اپنی دوست کی داستان کہتی۔ وہ الگ سی کہانی کہاں ہوگی؟ زمانے کے ستائے ہوؤں کا دکھڑا ایک سا ہوتا ہے۔

سیما نے اس کا نام شہزادی بتایا۔ وہ بڑھیا جسے میں نے گھڑی میں مسجد کی سیڑھیوں پر

ایک کونے میں کھانستے کھنکھارتے بخار میں تپتے جلتے نڈھال لیٹے ہوئے آدھ موا دیکھا تھا، وہی عورت ایک مریضہ کی صورت میں ہسپتال کے صاف ستھرے بستر میں سوتے ہوئے واقعی چھوٹی موٹی شہزادی لگ رہی تھی۔

افریقہ کا قحط ہو یا ایشیا کا غیر ہموار و غیر منصفانہ طبقاتی سماج، یہ پیٹ کا دوزخ ہی ہے جو اچھے اچھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتا اور حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ بھک منگوں کا ضمیر مر جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ دونوں اپاہج اور معذور نہ تھیں۔ وہ اپنے رنگ روپ کے برتے پر پیٹ کا دوزخ جسم بیچ کر بھی بھر سکتی تھیں پر انہوں نے پیٹ کے جہنم کے لئے روپہلے انگاروں کی جگہ روٹی کے باسی سوکھے ٹکڑوں کو ایندھن بنا لینے کو ترجیح دی۔

دن کو بھیک مانگ کر رات کو مسجد کی سیڑھیوں پر استراحت کرنے والی مخلوق کی اپنی دنیا تھی۔ اس دنیا میں وہ انفرادی حیثیتوں میں خود مختار تھے۔ یہ ایک ایسی شبینہ بستی تھی جس کے مکین ہر حال میں مست تھے کہ ان کے لئے سکون و بے سکونی بے معنی تھی۔ دنیا انہیں دن بھر دھتکارتی تھی اور یہ بلا چوں چرا سب سہہ لیتے تھے۔ پورے شہر کے دھکے کھانے کے بعد رات بسر کرنے لئے یہی ایک ٹھکانہ تھا جہاں انہیں کچھ دیر کے لئے راحت و آرام میسر آتا تھا۔ یہاں کوئی ان پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ شاید دھنوان، بھاگوان بھی خدا سے ڈرتے ان سے تعرض نہ کرتے تھے۔ اللہ کے ان سادہ بندوں کا کام بھیک مانگنا اپنے حصے کے لکھے سانس لینا یا اشارہ ملنے پر مذہب کے نام پر اپنی قیمتی جانیں نچھاور کرنا تھا۔ (یہ مذہبی پیشوا کا ووٹ بنک تھا) ان نڈر لوگوں سے حکومت وقت بھی ڈرتی تھی۔ یہ بے ہتھیار سپاہی تھے۔ ان کی جانیں ہی ان کا اثاثہ اور سب سے بڑا ہتھیار تھیں! لیکن ان کی صبح بخیر نہ ہوتی تھی۔ سوتے میں تڑپتے اور تڑپ کر جاگتے کوئی کھانس رہا ہے، خون اور

بلغم تھوک رہا ہے، گر گر پڑتا ہے۔ یہ بڑا دل شکن منظر ہوتا۔ ان کی حالت پر بے پرواہ اور بے نیاز راہ چلتے ہوئے لوگوں کا سکون بھی تلپٹ ہو جاتا کہ وہ بے بس اور مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ کسی کسی کو گہری نیند سے اٹھانا ہی ممکن نہ ہوتا۔ یوں ہمیشہ کیلئے سکھ کی نیند سو جانے والوں کو میونسپلٹی کے کارکن ٹرکوں میں لکڑیوں کی طرح ڈال کر کہیں دور لے جا کر گاڑ دیتے۔ وہاں کوئی پرسان حال یا رونے والا نہ تھا۔ بس خس کم جہاں پاک!

ایک الگ سا جہان'
میں اور سیما آباد کرنے کا سامان کر رہے تھے۔

ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ہم ہر وقت مستقبل کے منصوبے بنایا کرتے۔ حکومتوں کے کام افراد نہیں کر سکتے۔ ہم مقدس سیڑھیوں کا قرض اتارنے کے لائق نہ تھے لیکن پہلے سے یہ طے تھا شہزدی ہمارے ساتھ رہے گی۔ سیما نے یہ بات ابھی شہزادی کو بھی نہ بتائی تھی۔ شہزادی دھیرے دھیرے صحت یاب ہو رہی تھی۔ ادھر اڑوس پڑوس والے ہمارے ساتھ تال میل کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ میں' سیما سے روزانہ کہتا' اسکینڈل کھڑا ہونے سے پہلے قاضی صاحب سے نکاح پڑھوا لینا چاہیے یا سول میرج کے لئے عدالت چلتے ہیں۔

''ایک شادی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی'' اس کا جواب تھا ''کیا تم جانتے ہو'' میں تمہارے قابل نہیں' 'مدتوں پہلے کا سارا کرب اس کے چہرے پر چھا جاتا۔ یہ کہتے ہوئے وہ محض آڑ لے رہی ہوتی تاہم اس پر کبھی زیادہ بحث نہ ہوئی کیونکہ وہ میرے خیالات سے واقف تھی۔ میرے نزدیک سیما نے چودہ کا نہیں پورے تیس سال کا بن باس کاٹا تھا۔ وہ اس صدی کی سیتا تھی۔ مقدس مریم نے عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر زندگی کاٹی وہ فرشتوں کے سے تقدس کی حامل تھی۔ دراصل اسے الجھاوا اور گھبراہٹ تھی، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اسے جب بھی

اپنے کوائف دینے پڑیں گے کچھ ہو جائے گا۔ بات نکل گئی تو کہیں کوئی ٹنٹا کھڑا نہ ہو جائے پھر بلوہ ہوگا۔ عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے مارے جائیں گے، لڑکیوں کو اٹھا لیا جائے گا، عصمتیں لٹیں گی۔ قتل و غارت گری سے نفرتیں پھوٹیں گی، خون بہے گا، تعفن پھیلے گا۔ سیما کو مجھے گزند پہنچے کا خطرہ بھی تھا۔ وہ سچ مچ یقین رکھتی تھی جس دن شادی کا جوڑا پہنے گی اسے پہچان لیا جائے گا۔ میں دلیل دیتا عوام کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں میری یادگار تقریر کا حوالہ دیتی، استحصالی قوتیں گڑے مردے اکھاڑنے میں ماہر ہوتی ہیں۔ ممولوں کو شہباز سے لڑواتی اور رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکمرانی کرتی ہیں۔

ایک روز سیما نے سوچ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ کیوں نہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں؟

اسے،

سیما کو،

بے غم ہو کر، امن سے رہنے کا ایک ہی راستہ معلوم تھا! اس نے خرافات سے بچنے کے لئے مسجد کے زیر سایہ پناہ لینے کی دعوت دی تھی!! شاید بھول گئی تھی ایک انسان کی بنیادی ضرورتیں صرف روٹی سے پوری نہیں ہوتیں اسے تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کے لئے مکان بھی چاہیے ہوتا ہے۔

پھر،

جہاں دین اور فرقوں کے نام پر نفرت موت بن کر ناچتی ہے۔ ہمیں اسی دنیا میں جینا تھا۔ خطروں سے بھاگنے سے موت ٹلتی نہیں، زندگی بڑھتی نہیں۔ میں سیما کی دہشت زدگی کی ساری

وجہیں سمجھتا تھا۔ اسے دھیرے دھیرے قائل کر رہا تھا۔ ایک آشیانہ تو بنانا ہی تھا۔ مجھے امید تھی شہزادی کی صحت یابی پر اس کی مدد سے سیما کی ساری الجھنیں پلک جھپکتے حل ہو جائیں گی۔ اس کی سوچ سیما سے بڑی مختلف تھی اسے میری جیون کتھا سننے کا بھی شوق تھا۔

میں پردیس کیوں گیا؟ کیسے شادی ہوئی؟ بچوں نے اپنے ساتھی خود چنے؟ ماں نے 'باپ نے کسی نے دخل نہ دیا؟ یہ سیما اور اس کی دوست کے لئے بہت ہی عجیب داستان تھی۔ اس سے زیادہ حیرت 'انہیں اس بات پر تھی کہ ایسی آزاد فضا بھی ہوتی ہے۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں اپنے فیصلے خود کرتے ہیں! وہ بھی ہمارے اپنے لوگوں کی اولاد!!

میں بتاتا'

اس ماحول میں ہم لوگوں کی زبان' قدریں اور خیالات بدل رہے ہیں۔ ان کو اعتبار ہی نہ آتا کہ بچے ماں بولی بھول جاتے ہیں۔ تیس سال بعد میاں بیوی بنا لڑائی جھگڑے علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ طلاق کے بعد بھی ہنس ہنس کر ملا جا سکتا ہے۔ اختلاف اور خاندان کے بٹ جانے کے بعد بھی آپسی میل ملاپ رہ سکتا ہے۔ کوئی شکن نہیں پڑتی ' بال نہیں پڑتا، تریڑ نہیں آتی۔ میں اپنی سی کوشش کرتا کہ تضادات کی وضاحت کروں اور وجہ سمجھا سکوں کہ بعض باتیں یہاں اہم ہیں وہاں نہیں اور جو وہاں اہم ہے یہاں نہیں اور جو وہاں اہم ہے یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں دانستہ سیما کی ممی ڈیڈی کی بات نہ کرتا مبادا وہ اسے طعنہ سمجھ لے! درحقیقت یہاں کتنی اونچ نیچ ہے! مذہب کے نام پر خون خرابہ ہوتا ہے۔ تعصب ہے۔ زندہ مثال سیما خود ہے! کن حیلے بہانوں سے' خون کو خون سے بے قصور ہی جدا کر کے ''زندہ دفنا'' دیا جاتا ہے۔۔۔

بار بار سن کر بھی انہیں یقین نہ آتا کہ صفورا کو مجھ سے اور مجھے صفورا سے کوئی شکایت عداوت نہیں ہے۔ ایک رخ سے یوں بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے دل میں تو ایک ''سیمائی حور'' چھپی بیٹھی تھی! سوال اپنی جگہ قائم رہتا۔ اس کا جواز کیا دیتا کہ ہم ایک لمبے عرصہ تک ساتھ رہنے کے بعد کیوں جدا ہوئے؟ بچوں نے بھی کوئی مداخلت کیوں نہ کی؟ میں کہتا ہم محبت نہیں کر سکے۔ سمجھوتہ کنگ رفاقت تھی۔ دشمن ہم نہیں تھے۔ ایک سمبندھ بچوں کے کارن بھی تھا۔ مجھے اتنا سا رنج ضرور ہے کہ میں صفورا کا اور صفورا میری دوست نہ بن سکی اور جب اس پر تاسف ظاہر کیا کہ صفورا کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد 'بدقسمتی سے' صفورا کے ڈیڈی مفلوج ہو گئے۔ خواتین کی جس تحریک کیلئے اسے کام کرنے کا شوق تھا اب وہ والد کی دیکھ بھال کی بنا پر اس کے لئے وقت نکالنے سے قاصر ہے۔ یہ سن کر 'شہزادی اور سیما حیران ہو ہو جاتیں کہ میں اس واقعے کو' شوہر سے سرتابی کا عذاب یا قدرت کا عتاب کیوں نہیں سمجھتا؟ میں چپ ہو جاتا کیا ہمارے معاشرے میں توہم پرستی سے کوئی خالی نہیں؟

ان دنوں ہم شادی کی تیاریوں اور مناسب گنجائش والا مکان ڈھونڈنے میں پہلے سے بھی بہت زیادہ مصروف تھے۔ کیونکہ شہزادی نے صحت یاب ہو کر ہسپتال سے ہمارے یہاں رہنے کے لئے آنا تھا۔ شہزادی کے غسل صحت پر ایک جشن منانا طے تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ اس کو ساتھ لے کر ہم ان ساری جگہوں پر جائیں گے جن سے ہمارا ماضی اور کھلکھلاتی سنہری' معصوم معصوم یادیں وابستہ ہیں۔ سیما کے خوبصورت سوہنے موہنے چاند چہرے پر ہر روز ایک نئی مسرت چمکتی ہوتی۔ وہ شاداب شاداب دکھائی دیتی۔ جیسے اس کی زندگی سے مطابقت نہ رکھنے والا سارا عرصہ کوئی عضو علیل تھا۔ جسے کسی ماہر سرجن نے کاٹ کر دور پھینک دیا ہو۔ وہ اب رنج وغم کو نزدیک نہ پھٹکنے دے گی۔ اس کے گالوں پر اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں تازگی پلٹ آئی تھی۔ چہرے پر رونق اور چال میں

تمکنت، اس کا وقار بڑھا رہی تھی۔ لگتا نحوست ونکبت کی گھڑیاں بیت گئیں۔ وہ ٹھنڈی یخ سردی میں چلبل چلبل کرتی سورج کی کرنوں سے کھیل کر، دن گزارے گی اور رات کو ستاروں کے ساتھ رقص کرتی، سکھ کی نیند سویا کرے گی۔

مجھے بھی یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ کیا کھویا کیا پایا؟ کے گرداب سے نکلتے ہوئے اپنے آپ کو سبک اور زندہ زندہ محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ میرا نیا جنم تھا۔ لگتا تھا یہ میری دوسری نہیں پہلی شادی ہے۔ تاریخ مقرر کرنے سے پہلے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ ہمارے لئے سول میرج ہی مناسب ہے۔ ہم عدالت میں حاضری سے گھنٹہ بھر قبل سیما کی لازم وملزوم، غیر منفک (in-separable) دوست شہزادی سے مبارک سلامت کی دعا لینے ہسپتال بھی جائیں گے۔

ہسپتال کی انتظامیہ اتنی ظالم ہوسکتی ہے ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ہم شہزادی کو دیکھنے گئے تو ہمارے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہاں شہزادی نہیں تھی! ہمیں بغیر اطلاع دیئے مریضہ کو چار روز قبل ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ آپسی معاہدے کے مطابق ہر ہفتے پیشگی بل کی عدم ادائیگی بتائی گئی۔ دراصل ہسپتال کا ایک ایک فرد مریضہ کی حیثیت وحقیقت سے واقف تھا۔ کوئی اسے شہزادی کو ایک لاوارث فقیرنی سے زیادہ وقعت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ میرا پیسہ دوا تو خرید سکتا تھا مگر ذہنوں کا زنگ دور کرنے میں ناکام رہا تھا۔ میرا پتہ اور فون نمبر ان کے پاس تھا۔ ایک روز کی تاخیر کے بغیر پیشگی ادائیگی کرتا آرہا تھا۔ ان کے پاس مجھے نادہند سمجھتے ہوئے ایسا ظالمانہ فیصلہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ میں نے ہسپتال کی انتظامیہ کی بے توجہی اور مجرمانہ حرکت پر واویلا کیا مگر میرا احتجاج بے اثر تھا۔ انتظامیہ ڈسچارج کرنے کے بعد بری الذمہ تھی۔ انہیں اس بات سے بھی دلچسپی نہ تھی کہ مریضہ کس حال میں کہاں گئی؟ انہیں پیسوں سے غرض تھی۔ وہ انہوں

نے مجھ سے وصول کر لئے۔ اس صورت حال پر' سیما بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ وہ بے حال، سخت پریشان اور مصر تھی کہ شادی کو التواء میں ڈال دیا جائے۔ مگر التواء کے مرحلے کے بعد عدالت سے دوسری تاریخ لینا آسان نہ ہوتا چنانچہ آئندہ پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے وقت مقررہ پر عدالت میں حاضری ضروری تھی۔

ڈر اور خدشہ یہ تھا کہ عدالت سے شادی کی خبر پریس میں جا چکی ہوگی۔ ان دنوں سول میرج کو مقبول بنانے کے لئے سرکار حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اخبار عدالت سے شادی کی اطلاع حاصل کر کے شائع کر سکتے تھے۔ شروع میں تاکید تھی مگر اب کوئی رسمی اجازت بھی نہ لیتا تھا۔ عدالت کے باہر ایک نوٹس بورڈ پر تفصیل چسپاں کر دی جاتی۔ نمایاں طور پر یہ بھی تحریر ہوتا' کسی کو اعتراض ہو تو مجسٹریٹ صاحب سے رجوع کرے۔ ہماری شادی کی خبر چھپنے کے بعد' کسی وقت' کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سیما کو تو پہلے سے فساد کا وہم تھا چنانچہ اس بنا پر وہ مان گئی کہ شہزادی کی تلاش سے پہلے عدالت میں جانا اشد ضروری ہے لیکن ہم جس دھچکے سے دوچار ہوئے اس کی خبر نہ تھی۔

اس شب ہم شہزادی کو تلاش نہ کر پائے۔ صبح دور تھی۔ نئی صبح' نئی سحر جس کا انتظار تھا طلوع نہیں ہوئی تھی لیکن رات کتنی ہی لمبی ہو آخر کٹ ہی جاتی ہے' سو یہ رات بھی کٹ گئی۔

ہم وقت پر عدالت پہنچ گئے۔ انگوٹھیوں کے تبادلے' ضابطے کے اعلان اور رجسٹرار کی مبارک باد لیتے ہی ہم شہزادی کی تلاش میں' بڑی عبادت گاہ کی سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ اس کا برسوں کا ٹھکانہ وہیں تھا لیکن شہزادی ملتی کیسے؟ وہ وہاں نہیں تھی' جان بوجھ کر کہیں چھپ گئی تھی تاکہ اس کی دوست تاریک و تار تار جیون سے نجات پا کر نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔ سیما سخت پریشانی

کے حالت میں اپنی دوست کو ڈھونڈتی ادھر ادھر دوڑتی پھر رہی تھی سیما کو گھبراہٹ تھی کہیں شہزادی کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ گدڑی میں لعل شہزادی کے لئے ہمدردی کا سمندر میرے اندر بھی موجزن تھا۔ میں سیما سے کم پریشان نہ ہوں گا مگر میرے حواس قابو میں تھے۔ ہم سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ بے خیالی اور شہزادی کی بیماری کے پیش نظر عدالت سے سیدھے وہاں چلے گئے اس پر ستم نئے لباس اور نئے روپ کے باوجود سیما کو پہچان لیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گرد ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سبھی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیما کو مبارکباد دے رہے تھے۔ ہم سے بڑی عمر کے لوگوں نے سیما کے سر پر اپنا ہاتھ اور اس کے ہاتھ میں شگن رکھا۔ ''بیٹا دلہن بن گئی۔''

دلہن توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ مناسب یہی تھا کہ دلہن کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ تماشا بننے سے لحہ دو لمحے پہلے میں نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور ہم بمشکل وہاں سے نکل کر اپنے گھر پہنچے! شہزادی کا کچھ پتہ نہ چلا تھا۔ سب بے خبر تھے۔

سیما میرے پاس تھی'

وہ میرے ساتھ ہے۔

ہم سدا اکٹھے رہیں گے پھر بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ایک ایسا بھیانک خطرہ جس کی نوعیت کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا' ہماری طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی بڑا طوفان جو ہمیں نگل لے گا۔ سیما کو فساد کا سہم تھا مگر اب بلوائیوں سے زیادہ خطرہ ''اپنوں'' سے تھا جو دن میں پورے شہر میں پھیل جاتے تھے پھر رین بسیرے کے لئے ایک ہی مقام پر اکٹھے ہوتے تھے۔ ان کا روزانہ دستور العمل اور اچانک ہمارے ساتھ سامنا ہوتے رہنا' نت نئی کلفتوں کا دروازہ کھول سکتا تھا۔

میری روح کے اندر ایک اور خوف بھی رینگ رہا تھا۔ کیا ایک بار پھر درخت سفر باندھنا پڑے گا؟

میرے ساتھ جو کچھ ہوتا آیا ہے' وہ کم حیرت انگیز نہیں۔ میری خوشیوں کا چاند پورا ہوتے ہی حسرتوں کی راکھ میں ڈھل گیا اور اب اس راکھ سے نیا ققنس اٹھنے کو ہے تو نئی آندھیوں کا طومار گھیر رہا ہے۔

ان بچھڑی ہوئی قسمت کی ماری دو سہیلیوں کو بچھڑنے سے بچانا میری ذمہ داری تھی۔ مجھے معلوم ہونا چاہے تھا، یہاں ناواقف اور بے رسوخ لوگوں کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ان کے ساتھ کوئی رورعائت نہیں کرتا۔ ہر ہر لمحہ تاوان اور رشوت قدم پکڑتی ہے میں آخر اسی معاشرے کا ایک فرد تھا۔ مجھے یاد رکھنا چاہئے تھا اور وقت نکال کر ہسپتال میں ادائیگی کے لئے جانا چاہئے تھا۔ یہ چھپانہ تھا کہ غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں خود مجرمی میں مبتلا ہو کر پچھتا رہا تھا۔ یہ دو عورتیں مدت مدید کے بعد کنارے سے لگتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ڈوب جاتی ہے تو یہ میری ناقابل معافی خطا ہوگی۔

سیما میرے ساتھ آ تو گئی تھی مگر وہ گھر میں حاضر اور موجود نہ تھی۔ وہ دہلیز پار کرتے ہی نڈھال ہو کر گر پڑی۔ اس کے چہرے سے تھکن عیاں تھی۔ آنکھوں کی پڑپڑیاں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اصرار کے باوجود اس نے سکون آور دوا نہ لی۔ اسے کسی بھی مستقل ذہنی صدمے سے محفوظ رکھنے کے لئے آرام کی ضرورت تھی۔ اسے بہلانے اور سلانے کی اشد ضرورت تھی۔

شام گہری ہو چکی تھی روشنی مدھم کر کے میں سیما کو میٹھے بولوں میں سہانے اور سنہرے مستقبل کی لوریاں دینے لگا۔ دھیرے دھیرے، دھیمے دھیمے خیالوں کی جنت میں ہم دونوں ساتھ ساتھ اترے یا میں اکیلا، کچھ خبر نہیں۔

میں کب سویا، کوئی اندازہ نہیں جا گا تو سورج نہیں نکلا تھا۔ پو نہیں پھٹی تھی میں ابھی تک اپنے خوابناک تصورات میں ہی کسمسا رہا تھا کہ محسوس ہوا سیما بستر پر موجود نہیں۔ سوچا غسل خانے میں ہوگی۔ شاید چائے بنا رہی ہے۔ شاید بیکری تک گئی ہو لیکن بستر پر سیما کا پسندیدہ وہ سرخ کمبل بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو وہ میرے ساتھ خرید کر لائی تھی۔ وہ کہیں اور نہ گئی ہو؟ یہ احساس پوری طرح جھنجوڑ کر جگا گیا۔ کیا میں سیما کی، اپنی محبت کی پریشانی اور اذیت کا ٹھیک سے احساس نہ کر سکا تھا؟ کیا وہ مایوس ہو کر اکیلی ہی شہزادی کی تلاش میں نکل گئی؟ پیچھے میں سوتا رہ گیا؟ میں نے کبھی کھلے آسمان تلے کسی عبادت گاہ کے پچھواڑے، پتھریلی سیڑھیوں اور برفیلی ننگی سطح پر رات بسر کی ہوتی تو اندازہ کر پاتا۔ ندامت سے میں مفلوج ہو رہا تھا۔ احساس زیاں کا خنجر قلب میں اتر گیا۔ برق کی سی رفتار سے میں فلیٹ کے کونے کونے میں جھانک آیا۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی ہر طرف اوس، پالا اور کہرا تھا ایسے موسم میں صحت مند سے صحت مند انسان منجمد ہو جاتے ہیں۔ شہزادی کا کیا بنا ہوگا؟ سیما کہاں ٹھٹھر رہی ہے؟ شہزادی کا دوسرا کون ساٹھکانہ تھا؟ یہ خیال کوندا بن کر جا گا، وہ دونوں وہیں پرانی جگہ پر ہی ملیں گی۔ میں بے تحاشہ شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ کے مشرقی دروازے کی سیڑھیوں کی طرف بھگا۔

میں دوڑ رہا تھا اور سوچ رہا تھا،

شہزادی کچھ دیر کے لئے چھپ سکتی تھی مگر سیما سے زیادہ دیر چھپنا مشکل تھا۔ سیما آنکھ

بند کر کے اسے ڈھونڈ سکتی ہے۔ شہزادی دن میں کہیں ادھر ادھر ہو گئی مگر رات کو ٹھکانے پر ہی سونے آئی ہوگی۔ اگر سیما شہزادی تک پہنچ گئی تھی تو اسے گھر کیوں نہیں لے آئی؟ شہزادی کو بیماری نے لاغر کر دیا تھا پھر بھی بے چاری سیما اکیلی اپنی بیمار ہمجولی کو کیسے اٹھا کر لا سکتی تھی؟ میری گھبراہٹ بڑھ گئی۔ ٹانگیں پتھر کی بن گئیں۔ قدم قدم اتنا بھاری تھا کہ چلنا دوبھر تھا۔ کوئی سواری دور دور تک نہ دکھائی دی۔ چار، ناچار چل کر ہی شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ کے مشرقی دروازے کی سیڑھیوں تک پہنچا۔ جدھر دیکھا 'مخلوق خدا بے حس و حرکت مُردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس سخت جاڑے میں بچنا محال تھا۔ وہی زندہ اٹھے گا، جس میں جان کے علاوہ طاقت وقوت ہوگی۔ کسی کسی کے ہلنے جلنے اور کھانسنے کھنگارنے سے زندگی کے آثار کا پتہ چلتا تھا۔ جاگنے والے بلغم یا خون تھوک رہے تھے۔ کون جانے ان میں سے کون کون' سورج نکلنے سے قبل' دم توڑ دے گا۔

میں ابھی شہزادی کے ٹھکانے تک نہ پہنچا تھا کہ میونسپلٹی کی گاڑیاں منظر پر نمودار ہوتی نظر آئیں۔ میرا دل دھڑکا مجھ پر غم وخوف چھا گیا۔ بڑی عجلت سے رہ گیا فاصلہ طے کیا۔ وہاں ایک بے حس و حرکت جسم اکڑا ہوا نظر آیا جس پر وہی نیا سرخ کمبل پڑا تھا جو سیما اپنی پسند سے' میرے ساتھ خرید کر لائی تھی پاس ہی سیما اکڑوں بیٹھی تھی'

کیا؟

کیا؟

وہ بھی ــــــ وہ بھی؟؟

☆ جوش ملیح آبادی کا ایک فلمی نغمہ ــــــــــــــــ

لکڑی کی تلوار

میں آج پھر آپا کے سوال کا جواب سوچتا رہا!

ابھی پرسوں ہی قلزم بٹ نے مسجد سے نکلتے ہوئے جس شخص سے تعارف کرایا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ قلزم کی بیٹی ہنیا ہمیں مسجد کے دروازے پر اتار کر کار لے گئی تھی کہ آدھے گھنٹے بعد آ کر اٹھا لے گی۔ باہر بارش ہو رہی تھی اس لیے بھی ہم اندر دبکے کھڑے رہے۔ اسی دوران ایک آدمی پیچھے سے آیا اور قلزم سے پرتپاک سلام کے بعد خبر و خیریت پوچھی۔ میں الگ کھڑا رہا۔ جب وہ شخص جانے لگا تو میرے دوست نے تعارف میں کہا ''احمدان سے ملو یہ قدیر بھٹ ہیں۔ شہر کی ایک امیر و معزز شخصیت۔'' مصافحہ اور دو چار خیر سگالی کے الفاظ کے ساتھ بھٹ نے اپنی نئی مرسیڈیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آفر کی ''چلئے میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔'' قلزم، میرے یار نے جواب دیا ''میری بیٹی ہمیں لینے آ رہی ہے، آتی ہوگی۔ ہمیں یہاں موجود نہ پا کر الجھن محسوس کرے گی۔'' اس پر بھٹ صاحب بغیر اصرار و تکرار خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

قدیر بھٹ پر، جماعت کھڑی ہونے سے پہلے، میری نگاہ پڑی تھی۔ پچھلی صف میں بڑھاپے کی طرف بڑھتا ہوا یہ شخص جس نے قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا، کلین شیو تھا۔ اس سے زیادہ تاثر لینے کا وقت نہ تھا۔ دعا کے بعد اٹھتے ہوئے میرا دھیان اس کی طرف بالکل نہ گیا لیکن جب وہ قلزم سے مل رہا تھا تو پھر خیال اُگا کہ یہ صاف ستھرا اور امیر کبیر آدمی ہے۔ یہ بھی سوچا جمعہ یا عیدین کے علاوہ عام طور پر عام آدمی ہی مسجد میں آتے ہیں۔ بھٹ نیک آدمی ہوگا کہ غرور نہیں کرتا اور محلے کی مسجد میں سب کے ساتھ جماعت میں آ شامل ہوتا ہے۔

قلزم میرا لنگوٹیا ہے۔ ہم اکٹھے ولایت آئے اور اکٹھے ایک ہی مل میں کام کرتے

رہے۔ ایک ساتھ ریٹائر ہوئے ایک ہی محلے کی ٹیریس ہاؤسز کی لمبی قطار میں کسی قدر فاصلے پر رہتے تھے۔ مگر اب ملاقات بچوں کی تقریبات پر ہوتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ چالاک انسان چپکے چپکے کئی عمرے کرنے کے بعد گزشتہ سال حج بھی کر آیا ہے تو میں پھڑک گیا دیکھو! عاقبت کا سامان کر رہا ہے اور میں ہنوز خواب غفلت میں پڑا ہوں۔ ہم اکٹھے ''شکار'' پر نکلتے تھے۔ زیادہ کیا کہوں، اکٹھے ''جھک'' مارتے تھے۔ شراب ہم نے کبھی پی نہ پب میں گئے۔ باقی دنیا کا کونسا عیش (عیب) تھا جس کے ساتھ ادھار کیا ہو؟ یہ سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے حالانکہ شروع میں ڈینگ مارتے رہے کہ جب وطن سے پہلی طوائف آئی تو اس کا سب سے پہلا مجرا سننے اور دیکھنے والے ہم دونوں اولین تماشائی تھے۔ اب اور بات ہے، پیری ہے اور پرہیز گاری ہے ☆۔ غیرت کھا کر جب میں نے تجویز کیا کیوں نہ ہم مسجد بھی اکٹھے جایا کریں تو وہ پہلے جھینپا پھر مجھے فون کر کے بلانے لگا کہ اذان ہوگئی ہے۔ آجاؤ فلاں کا جنازہ بڑی مسجد میں ہے، لینے آجاؤں؟ دراصل اس کا گھر مسجد کے پاس تھا۔ اول میں ہی اس کے ہاں دستک دیتا لیکن جب جب ذرا تاخیر ہوئی کھٹ سے اس کا فون آجاتا۔ ''اذان ہو رہی ہے''۔ ہمارا شہر برطانیہ کے ان شہروں میں سب سے آگے ہے جہاں لاؤڈ اسپیکر پر پانچوں وقت اذان کی اجازت ہے۔ محلے کے بچے کھچے انگریزوں نے اعتراض کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ اس پر مسرت کا اظہار کرتے تھے کہ ہم گھل مل جانے والے لوگ ہیں۔ جب نیا پکوان پکتا ہے تو ذائقہ چکھنے کے لئے چھوٹی ڈش بھر کر پڑوس میں بھی بھیجنے کا دستور ہے۔ بڈھے بڈھے انگریز بھی مرچوں بھرا سالن کھالیتے تھے۔ بھٹ صاحب کے جانے کے بعد بٹ پہلے نما نما یعنی ہلکے ہلکے مسکرایا پھر کچھ لمحوں تک ہنستا رہا۔ اس کی آواز بس قہقہے سے ذرا سی کم تھی۔ جب اس کی ہنسی تھم گئی تو بولا ''بھٹ ہماری کشمیری برادری کا بندہ ہے لیکن بٹ کے بجائے بھٹ لکھنے لگا اور بھٹ ہی مشہور ہو گیا''۔ ''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''بتاتا ہوں'' قلزم بٹ نے کہا۔ وقفہ میں وہ ذرا کھل کر مزید ہنسا پھر بولا ''بٹ کشمیری ہوتے ہیں لیکن بھٹ کشمیری

نہیں ہوتے۔ اپنے آپ کو پنجابی کہتے ہیں لیکن اب کچھ کشمیر میں آباد ہو گئے ہیں ہمارا قدیر بٹ تقریباً برادری باہر تھا، جب بھٹ بن گیا تو تمہاری طرح کے نئے لوگ ضرور سوال کرتے، بھئی! بھٹ کیسے؟ لطف یہ ہے اس سوال کا جواب اس کو خود کبھی نہ دینا پڑا کیونکہ جس سے سوال پوچھا جاتا وہی جواباً کہتا " ہے تو یہ بٹ ہی بن گیا ہے بھٹ!" اس طرح اس شخص نے برادری باہر کرنے کا بدلہ بھی لے لیا اور اپنی شناخت بھی برقرار رکھی یہاں اس شہر میں واحد بھٹ یہی ہمارے قدیر صاحب ہیں۔

" آدمی ذہین ہے" میں نے سوچا اور پھر باہر دیکھنے لگا کیا ہنیا آ رہی ہے؟ کتنا انتظار اور کرنا ہوگا؟ بارش نہ ہو رہی ہوتی تو ہم پیدل ہی گھر چلے جاتے۔

مجھے کیا خبر تھی کہ ایک دفعہ کے ذکر کے بعد اب بار بار بھٹ سننے میں آئے گا۔ تین دن نہ گزرے تھے کہ آپا اپنی بیٹی کے لئے بھٹ صاحب کے یہاں سے رشتہ آنے پر مشورہ کرنے چلی آئیں۔ ہماری کمیونٹی کا انگریزی دان اور روشن خیال طبقہ بھی برادری کا طوق پسند نہیں کرتا مگر اکثر شریف گھرانوں کے بچوں کی شادی ماں باپ ہی طے کرتے ہیں۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ قلزم نے قدیر صاحب کے بٹ سے بھٹ بننے کی کتھا کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ بھٹ کے وطن عزیز میں تین شاندار "محل" اور نئی (ڈیفنس) بستیوں میں کئی جدید طرز کے "بنگلے" ہیں لاکھوں روپے کرائے میں آتے ہیں۔ سال میں تین چار مرتبہ وطن کا چکر لگاتے ہیں اور۔۔ اور ان کے تین بیٹے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہے، ایک سالیسٹر ہے اور سب سے چھوٹا کمرشل پائلٹ ہے۔ بچے بڑے نیک ہیں۔ کبھی ان کے بارے میں ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ ورنہ نئی نسل نے کیا کیا اودھم نہیں مچا رکھا۔ اسکول' کالج اور یونیورسٹی تک کے طلباء طالبات پر نگاہ کرو۔ دوسری طرف تعلیم تہذیب سے کورے نوجوانوں کے کرتوت دیکھو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ دیسی کلچر اور طرز معاشرت سے نفرت کرتے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر نشے اور بدمستی کے ریکارڈ قائم کر

رہا ہے۔ان کے آگے ہمارے زمانے کے آوارہ گمراہ اور بدترین مجرم بھی شرمائیں۔ ملک بھر میں اپنا یہ شہر کوکین اور کریک کے بزنس کے لئے بدنام ہے۔ آئے دن گرفتاریاں ہوتی ہیں مگر مجال ہے ان بدقماش لوگوں کی سرگرمیوں میں کمی آئے۔ ساون آئے، بھادوں جائے، ڈرگ کا دھندہ چالو رہتا ہے۔

بہت سوچ سمجھ کر میں نے آپا کو مشورہ دیا کہ رشتہ منظور کرلیا جائے۔ بیٹی سکھ چین سے رہے گی۔ ہمیشہ راج کرے گی۔ اتفاق ہے کہ آپا کی اکلوتی بیٹی زینب خوبصورت اور حسین تو تھی مگر تعلیم زیادہ نہ تھی۔ جب کونسل نے اقلیتوں کے لئے ''برابری مواقع کی'' پالیسی اختیار کی تو اسے ایک پرائمری اسکول میں ''ڈنر لیڈی'' کی جاب مل گئی پھر جب اسکول کو بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے کوئی کوالیفائڈ ٹیچر نہ ملا تو اسے اندرون محکمہ ایک قسم کی تھوڑی بہت تربیت دلوا کر ایک سرٹیفکیٹ حاصل کر لینے پر اردو ٹیچر کی تقرری مل گئی۔ یوں بھی آپا کی شہرت ایک سلیقہ منداور خوددار خاتون کی تھی۔ جس نے بیوہ ہوکر بھی کہیں سے امداد نہ لی۔ سرکار سے کوئی بینیفٹ نہ لیا۔ پنشن زیادہ نہ تھی مگر سلائی میں مہارت کی وجہ سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ کام اچھا' کام کی رفتار بھی تیز پیشہ ور درزی سے دو پونڈ کم محنتانہ لیا کرتیں بلکہ خواتین کو مشورہ دیتیں کہ جب وطن جاؤ تو وہاں سے دو چار جوڑے سلوالایا کرو۔ یہاں شلوار قمیض کی سلائی کے چودہ چودہ پونڈ دیتی ہو وہاں اتنی رقم میں نصف درجن نہایت بڑھیا اور فیشنی جوڑے بن جاتے ہیں!

شاید میرے کہنے میں کچھ فرق تھا، آپا کو میرا مشورہ برا لگا۔ ''بھئی صحیح صحیح بتاؤ کوئی بات راز میں نہ رکھنا۔ ٹھیک ہے تمہاری کوئی بیٹی اولاد نہیں مگر میری زینب بھی تو تمہاری بیٹی ہے۔ شادی زندگی بھر کا جوا ہے۔ یہ نہ ہو کہ میں بیوہ اسے ایسے جہنم میں دھکیل دوں جہاں اسے پل بھر سکھ نہ ملے'' اور ساتھ ہی ان کے آنسو بہنے لگے۔ آپا کے آنسو اور جس درد و خلوص سے مشورہ مانگ رہی تھیں میں ان کے آگے پگھل گیا۔ اندر ہی اندر خدا سے ڈرا اور کانپ اٹھا۔'' آپا کوئی راز نہیں شریف لوگ

ہیں۔ بچے یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور نہایت اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ دیانت داری سے مشورہ دیا ہے۔ بخدا میری بیٹی ہوتی اور بھٹ صاحب رشتہ مانگتے تو انکار نہ کرتا۔ بچے اس ماحول میں بھی نیک اور انسانیت کا نمونہ ہیں۔ محنت و ذہانت کے بل بوتے پر اونچا مقام پا گئے ہیں۔ باپ بھی بڑا محنتی تھا۔ یہ سب باپ کی جگر کاری کا پھل ہے'' اس کے ساتھ ہی میں نے وہ ''راز'' بھی بتا دیا جو مجھے قلزم نے بتایا تھا کہ قدیر کام کرنے میں ہیٹا نہ تھا۔ بلا کی ہمت رکھتا تھا جب لوگ مل چھوڑ کر تھکے ہارے گھر آتے تو وہ گھر کے بجائے راستے میں اپنے لوگوں کے مکانوں پر دستک دیتا اور ضرورت مندوں کی حجامت کرتا آتا۔ ایک ڈائری بنا رکھی تھی جس میں لوگوں کے یہاں دستک دینے کا دن اور وقت درج ہوتا۔ اس طرح دن رات کی شفٹ لگانے والوں کو گھر بیٹھے سہولت ملنے سے وقت کی بچت ہو جاتی تھی۔ پھر انگلستان میں رہ کر انگریز کے آگے سر جھکانے سے بھی بچ جاتے تھے۔ بھٹ کے باپ دادا کا یہ پیشہ نہ تھا مگر اس نے پیسے بنانے کی یہ ترکیب نکال لی تھی۔ پیسے تو خوب کمائے مگر خمیازہ بھی بھگتا۔ برادری نے قدیر کو بٹ کہنا ماننا یا سمجھنا چھوڑ دیا۔ جتنا دوسرے اوور ٹائم سے ایک ہفتے میں کماتے تھے، قدیر میاں اس سے زیادہ روزانہ اجرت جمع کر لاتے۔ انہوں نے جو کمایا' محنت اور ایمانداری سے کمایا۔ اللہ نے حق حلال کی کمائی میں برکت دی۔ اب بھٹ صاحب اس مقام پر ہیں کہ رشک کیا کرے کوئی! رشک کیا اکثر ہی حسد کرتے اور جلے مرتے ہیں۔

آپا کو جیسے بھڑ نے کاٹ لیا۔ کاٹ کیا لیا تتیا بدن پر اپنا ڈنگ چھوڑ گیا۔ وہ فیل مچایا'' یہ خوب کہا کہ میری بیٹی ہوتی تو رشتہ مان لیتا، بیٹی ہی نہیں ہے نا! میں رانڈ تم پر بھروسہ کرتی ہوں، اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں، کیا خوب مشورہ دیا ہے۔ قیامت کے روز میں ''ان'' کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ ان کی بیٹی کو کہاں بیاہ دیا؟ اے میں نہ کر یدتی تو تمہارے مشورے پر بیٹی کو کم ذاتوں میں دھکیل نہ دیتی؟ اللہ کا شکر بال بال بچ گئی۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ پیسہ اور دولت ہی کیا سب کچھ ہے؟ ہماری

نجابت وشرافت پشتوں سے تم پر ظاہر ہے اور کہہ رہے ہو کہ رشتہ منظور کر لو۔

میں کیا کہتا؟ آپا تم بھی تو محلے کے کپڑے سیتی ہو! کیا تمہارا حسب نسب بدل گیا؟ ذات بدل گئی؟ درزن بن گئیں ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ لیاقت شرافت دیکھو بڑے بڑے معزز گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں آرائش گیسو کے نام پر بال کاٹتے، بناتے ہیں تو ان کی قینچی کنگھی حجام کی قینچی کنگھی سے جدا ہوتی ہے کیا؟ اگر قدیر نے حجامت کر کر کے کمایا، گناہ نہیں کیا کسی پیشے پر نیچی ذات کا ٹھپہ تو حسد کرنے والے لگاتے ہیں ورنہ کیا حجام انسان نہیں ہوتے؟

آپا نے شاید میرے خیالات پڑھ لئے تھے گرج کے ساتھ فرمایا ''وہ محاورہ نہیں سنا بندہ ہے یا نائی؟ یعنی ان میں سے بعض کے کرتوت ایسے ہوتے ہیں کہ محاورہ بن گیا''۔

آپا کے نزدیک دو ہی اونچی ذات ہیں ایک سید' دوسرے شیخ۔ آپا مجھے بخشنے والی نہ تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ قلزم بٹ میرا دوست ہے۔ ان کے بھاویں وہ کونسا اعلیٰ نسب تھا۔ یہاں ساری عمر ''مل ورکر'' ہی رہا۔ طنز کیا۔ ''تمہارے بٹ نے بھی تو بچوں کو پڑھا لکھا لیا۔ اس کے ہاں سے رشتہ آتا تو تم اس کے لئے بھی یہی کہتے؟ بالکل بھلا دیا کہ زینب ددھیال' ننھیال سے اصل حجازی سید ہے اور آپ کہہ رہے ہو کسی ایرے غیرے کے پلے باندھ دوں؟''

۔۔۔۔ اور آپا ناراض ہو کر چلی گئیں ان کی طنز وحقارت میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ ''یہ ولایت ہے بھائی! یہاں سب چلتا ہے''۔ میں کچھ یوں سراسیمہ ہوا کہ آپا کو روک بھی نہ سکا۔ ان کے جانے کے بعد بیوی کی الگ سنیں۔

مہینے دو نہیں گزرے تھے کہ آپا بڑی خوش وخرم اور چہکتی مہکتی تشریف لائیں۔ اب کے وہ میرے منانے کے لئے انڈوں کا حلوہ بنا کر لائی تھیں۔ حلوؤں کی وہ ماہر تھیں۔ انڈے کا حلوہ تو بس ایسا ہوتا کہ انگلیاں چاٹو۔ وہ بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ہنستی ہنساتی رہیں پھر سنجیدہ ہو کر کہا سخت شرمندہ ہوں۔ تمہیں خبر کرنے میں تھوڑی دیر ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنی

زینب کا رشتہ پکا ہو گیا ہے۔ اگلے مہینے کی پندرہویں کو بارات آ رہی ہے۔ برا نہ ماننا لڑکے والوں نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ تم سے یا کسی سے مشورہ کرتی۔ بس اللہ کے بھروسے پر ہاں کر دی۔۔۔

''آپا! کون لوگ ہیں؟'' میں نے تفصیل جاننی چاہی۔ آپا نے کہا ''اپنے ہی ہیں۔ سید ہیں۔۔۔۔ لوگ نام دھرتے ہیں۔ دادا یا سگڑ دادا بازاری عورت بیاہ لائے تھے۔۔۔۔ اے۔۔۔ کبھی کا قصہ ہے'' آپا بولتی چلی جارہی تھیں ''دنیا کا کیا ہے؟ لوگ باگ حسد جلن میں بے پر کی اڑا دیتے ہیں۔ میرے دل کو اطمینان ہے کہ سیدزادے ہیں۔ باپ سے ہی نسل چلتی ہے۔۔۔۔ شریف ہیں۔ دولت اس خاندان پر عاشق ہے۔'' آپا کی گفتگو کیا تھی روزنامے کی چلتی چلتی سرخیاں تھیں بلکہ شہ سرخیاں۔ آپا بتا بھی دیجئے کون لوگ ہیں؟ پوچھ میں رہا تھا پر میرا تجسس میری بیوی کے چہرے سے علیحدہ سے عیاں تھا۔ آپا نے اترا کر فرمایا ''آپ خواہ مخواہ نہ بنو۔ تم جانتے نہیں کیا کہ یہ دو چار جو سید گھر یہاں ہیں، ان میں سب سے نمایاں کون ہے؟'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے میری اہلیہ کو بھی سنایا۔۔۔۔۔۔ آپا کے بشرے پر فخر وانبساط کا نقش گہرا تھا۔ ''آپا سچی ہمارا قیافہ بالکل کام نہیں کر رہا'' بیگم صاحبہ نے چپ توڑی۔ ''اے ہے وہی اپنے ٹریول پورٹ والے''۔ آخر، آپا کے تھیلے سے بلی کود پڑی۔

شاید ہم میاں بیوی کے چہروں کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ آپا کی نظروں سے چھپا نہ ہو گا مگر انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ''دنیا جو کہے کہتی رہے۔ میرا دل مطمئن ہے۔ خاندانی لوگ ہیں۔ زینب بہت خوش رہے گی۔'' میں گومگو میں تھا مگر میری بیگم سے خاموش نہ رہا گیا ''آپا کمال کرتی ہو نام ٹریول بزنس کا ہے پر وہ لوگ شروع سے کالے دھندوں میں ملوث ہیں۔ اندر بھی رہ آئے ہیں۔ کہیں دیکھ کر بھی کوئی مکھی نگلتا ہے؟'' آپا نے فوراً بات کاٹی اور برا بھی نہ منایا۔۔۔ ''دنیا کا کیا ہے؟ ہر کسی پر عیب دھرتی ہے۔'' لاجوابی میں میرے منہ سے نکلا ''بٹ اچھے نہ بھٹ سب سے اچھے سید۔۔۔'' اور میں کیا کہتا۔ ''ہاں میں نے سب سن لیا ہے۔'' آپا کی بشاشت میں کوئی فرق

یا کمی نہ آئی۔ جملہ پیوست کرتے ہوئے فرمایا ''تم بے شک حیران ہو۔ لڑکے کے تایا ابو نے خود مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، تم جانو کاروبار میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔۔۔''

دو گھڑی خاموشی چھائی رہی۔ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے میری بیوی نسیمہ نے پھر بات اٹھائی ''دو دفعہ پولیس کا چھاپا پڑ چکا ہے۔۔۔'' آپا نے قہقہہ مارا ''سنو پولیس سب کچھ پونچھ پانچھ کے لے گئی ہوتی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ کسی احمق کا دھیان نہ گیا۔ کسی کو ڈش واشر اور واشنگ مشین نظر نہ آئی، دونوں مشینیں نوٹوں سے بھری پڑی تھیں۔ خدا کی قدرت پولیس اندھی ہو گئی تھی''!!

آپا سیانی اور سمجھدار ہو گئی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں مانگا۔

مگر، میں سوچ رہا ہوں،

ہاں میں سوچ رہا ہوں!!

☆ توبہ کردن در جوانی شیوہ پیغمبریست، در ایام پیری گرگ باراں دیدہ می شود پرہیزگار!

M. E. Sheikh's

Chand Chehray Samundar Ankhein

Compiled by: **Muhammad Shafique**

مرتب: محمد شفیق